جلد (۷) عدد ۵
ذیقعدہ ۱۳۵۴ھ

رجسٹرڈ نمبر آصفیہ ۱۲۰
رجسٹرڈ نمبر ایل ۲۹۵۰

۵۸۶

ماہنامہ

ترجمان القرآن

علوم قرآنی و حقائق فرقانی کا ذخیرہ

مرتبہ

سید ابوالاعلیٰ مودودی

قیمت سالانہ (صہ)
قیمت فی پرچہ ۸؍

الجہاد فی الاسلام

(تالیف)

ابو الاعلیٰ مودودی

اسلام کے جن مسائل پر مخالفین نے سب سے زیادہ حملے کئے ہیں اُن میں سے ایک مسئلہ جہاد بھی ہے اس مسئلہ پر ایسی شدومد کے ساتھ اعتراضات کیے گئے کہ بہت سے مسلمان بھی ان سے مرعوب ہو گئے اور انہوں نے دشمنوں کے اعتراضات کو رفع کرنے کے لیے خود اسلام کے احکام اور اس کی تعلیمات میں قطع و برید شروع کر دی۔ اسلام کے حامیوں کی جانب سے اس مسئلہ پر جو کچھ لکھا گیا وہ سب معذرت Apology کے انداز میں تھا جس سے صریح کمزوری اور مرعوبیت ظاہر ہوتی تھی۔ مولانا شبلی مرحوم اور مولانا ابو الکلام آزاد نے البتہ اس مسئلہ کو صاف کرنے کی کوشش کی مگر پورا پورا حق ان کی تحریروں سے بھی ظاہر نہیں ہوا۔ ضرورت تھی کہ ایک مفصل کتاب اس موضوع پر لکھی جاتی جس میں جنگ کے متعلق اسلام کی تعلیم اور اس کے مقاصد اور احکام کو تفصیل کے ساتھ صاف صاف بیان کر دیا جاتا، اور دوسرے مذاہب اور قوموں کے اصول و قوانین جنگ سے مقابلہ کر کے ثابت کیا جاتا کہ اسلام کا جہاد اپنے مقاصد اور قواعد و ضوابط کے لحاظ سے سب پر فوقیت رکھتا ہے۔

الجہاد فی الاسلام نے اسی ضرورت کو پورا کیا ہے۔ یہ کتاب معذرت کے انداز میں نہیں بلکہ اظہارِ حق کے انداز میں لکھی گئی ہے اور ضمناً اس میں ہندو مذہب، بودھ مت، مسیحیت، یہودیت اور قانون بین الاقوام International law پر ایسے مباحث بھی آگئے ہیں جو ابھی تک اردو زبان کے لیے بالکل نئے ہیں عام طور پر تسلیم کیا گیا ہے کہ اس موضوع پر ایسی کوئی کتاب صرف اردو ہی بلکہ کسی مشرقی یا مغربی زبان میں نہیں لکھی گئی۔

ضخامت (۵۰۰) صفحات قیمت [illegible] جلد (للعہ) سکہ انگریزی (للعہ) سکہ عثمانیہ (مجلد کی قیمت [illegible] سکہ انگریزی [illegible] سکہ عثمانیہ!

دفتر ترجمان القرآن سے طلب فرمائیے (یہ کتاب مکتبہ علمیہ چارمینار سے بھی مل سکتی ہے)

فہرست مضامین

ماہ ذیقعدہ سنہ ۱۳۵۴ھ جلد ۷ عدد ۵

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اشارات

اس اشاعت میں ہمارے مضمون "حقوق الزوجین" کا سلسلہ ختم ہو رہا ہے۔ اس مضمون کو عنقریب ایک رسالہ کی شکل میں شائع کیا جائیگا، اور ہندوستان کے علماء، مدیران جرائد، ارکان مجالس تشریعی اور دوسرے اہل الرائے حضرات کے پاس بھیج کر ان سے استدعا کی جائے گی کہ جن امور کی طرف اس مضمون میں توجہ دلائی گئی ہے ان پر غور وخوض کر کے اپنی رائے کا اظہار کریں۔ اس وقت حسن اتفاق سے مسلمانوں کو اپنی سوسائٹی کے مفاسد میں سے ایک مفسدہ کی طرف توجہ ہوگئی ہے، اور وہ اصلاح حال کے لیے سعی کرنے پر مائل نظر آتے ہیں۔ یہ ایسا موقع ہے جس سے فائدہ اٹھا کر کم از کم ایک خرابی کا تو پورا پورا استیصال کیا جا سکتا ہے۔ اگر اس وقت ایک ناقص تدبیر میں کامیاب ہو کر ہمارے ارباب حل وعقد مطمئن ہوگئے، تو پھر برسوں کے لیے ان کا جوش عمل سرد ہو جائے گا، اور امید نہیں کہ کم از کم اس قرن میں اصلاح کا کوئی دوسرا موقع بہم پہنچ سکے۔ مسلمانان ہند کی نیند اور بیداری کا جو حال ہم مدتوں سے دیکھ رہے ہیں، اس سے ہم کو یہی سبق ملتا ہے کہ ان کی بیداری دو طویل خوابوں کے درمیان محض ایک کروٹ کی حد تک ہوا کرتی ہے۔ اگر کسی کو کچھ کام کرنا ہو تو بس اسی کروٹ کے دوران میں کرلے۔ جس نے اس تھوڑے سے وقت کو کھو دیا، کچھ عجب نہیں کہ اسے پھر صور اسرافیل ہی کا انتظار کرنا پڑے۔

ہم کو اس مجلس مشاورت کے فیصلے کا انتظار تھا جو مراد آباد میں جمعیت علماء ہند کی جانب سے منعقد کی جانے والی تھی۔ اب اس کا نتیجہ بھی شائع ہوگیا۔ مسلسل اور پیہم سعی اور دو روزہ غور وخوض کے بعد علماء ہند کی مرکزی جمعیت نے بہت سے اکابر اہل علم واہل رائے کی مدد سے جو مسودۂ قانون مرتب کیا ہے اس کا خلاصہ بس اتنا ہے کہ مسلمان عورتوں کو چند مسائل میں فقہ مالکی کے مطابق فسخ نکاح کا دعویٰ کرنے کا حق دیا گیا ہے۔

اور بعض دوسرے مسائل میں فقہ حنفی کے مطابق فیصلہ کرنے کی ہدایت کی گئی ہے۔ دو تین صدیوں کے مسلسل اخلاقی، دینی اور تمدنی انحطاط، اور ایک غیر مسلم حکومت کے استیلاء کی بدولت اسلامی تمدن و تہذیب کے ضعف اور اسلامی نظام تعلیم و تربیت کے اضمحلال اور اسلامی قوانین کے عدم انفاذ سے جو خرابیاں ہماری معاشرت میں پیدا ہو گئی ہیں، ان کی کماحقہ تحقیق و تفتیش کرنے اور موجودہ حالات میں قانون سازی کے جو محدود ذرائع ہم کو حاصل ہیں ان سے تا بحد امکان فائدہ اٹھا کر اصلاحِ احوال کی تدبیریں معلوم کرنے کے لیے اگر صرف "دو روزہ غور و خوض" ہی کو کافی سمجھا جاتا ہے، اور اسی کا نام "مسلسل پیہم سعی" رکھا گیا ہے تو سمجھنا چاہیے کہ ہمارے ارباب حل و عقد کے ذہن میں سرے سے ان ذمہ داریوں کا ہی کوئی صحیح تصور موجود نہیں ہے جو اولی الامر ہونے کی حیثیت سے ان پر عائد ہوتی ہیں۔

جمعیت کے مسودہ میں تجویز کیا گیا ہے کہ حسب ذیل مسائل کا فیصلہ فقہ مالکی کے مطابق کیا جائے:

(۱) شوہر کا مفقود الخبر ہونا۔

(۲) اس کا جنون یا جذام یا برص میں مبتلا ہونا جب کہ یہ امراض سخت قسم کے ہوں۔

(۳) اس کا نفقہ نہ دینا یا دینے پر قادر نہ ہونا۔

(۴) اس کا ناقابل برداشت ظلم کرنا۔

(۵) اس کی مفقود الخبری یا طویل قید یا تعنت کی وجہ سے عورت کی عصمت خطرے میں ہونا۔

ان مختصر دفعات میں فقہ مالکی کے احکام کی کوئی تصریح نہیں ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ عدالتوں کے پاس مالکی فقہ کی تفصیلات معلوم کرنے کا کیا ذریعہ ہے؟ مسلمان حکام میں سے کتنے ایسے ہیں جو مالکی مذہب کے مبسوطات پر نظر رکھتے ہیں یا ان کو پڑھ اور سمجھ سکتے ہیں؟ وکلاء جن کا کام فریقین کے مقدمہ کو قانونی صورت میں پیش کرنا ہے، اور جن میں ہندو، مسلمان، پارسی، عیسائی سب شامل ہیں، مالکیہ کے احکام معلوم کرنے کا کونسا ذریعہ رکھتے ہیں؟ ان سب کو چھوڑیے، ہندوستان کے علماء میں سے کتنے ایسے نکلیں گے جن کو مذہب مالکی کے جزئیات پر عبور حاصل ہے؟ ایسی صورت میں

کیا اس مختصر دفعہ کا نتیجہ یہ نہ ہوگا کہ احکام سے ناواقفیت اور ان کی غلط تعبیرات، اور غلط نظائر سے پھر ایک غلط قانون بن جائیگا اور پھر ساٹھ ستر سال کے تلخ تجربات کے بعد ایک دوسرا مسودہ قانون مرتب کرنے کی ضرورت محسوس کیجائیگی۔

اختصار پسندی کی انتہا یہ ہے کہ "طویل قید" کو بنائے فسخ نکاح قرار دیا جاتا ہے، مگر اس کی تشریح نہیں کیجاتی کہ طویل قید سے مراد کیا ہے؟ حبس دوام یا دس سال یا پانچ سال یا کچھ اور؟ خود مالکی مذہب کے احکام میں بھی اس کی کوئی تشریح ہماری نظر سے نہیں گذری، بلکہ مالکی مذہب میں تو سرے سے "طویل قید" کو وجہ فسخ ہی قرار نہیں دیا گیا ہے۔ اگر وجہ فسخ محض عصمت کا خطرے میں ہونا قرار دیا جائے تو ایک عورت چھ مہینے یا تین مہینے کی قید پر یہ دعوی کرسکتی ہے کہ میری عصمت خطرے میں ہے، لہذا نکاح فسخ کیا جائے؟

نمبر ۹ میں "ناقابل برداشت ظلم" کے الفاظ بالکل مبہم ہیں اور ان کی کوئی تشریح نہیں کیگئی ہے۔ شوہر کی بعض عادات ایسی ہوتی ہیں جو عورت کے لیے ناقابل برداشت روحانی عذاب بن جاتی ہیں، مثلاً کثرت شراب نوشی، قماربازی، زناکاری وغیرہ۔ یہ چیزیں عام اصطلاح کی رو سے "ظلم" کی تعریف میں نہیں آتیں، اس لیے ان کی تصریح اس دفعہ میں ہونی چاہیے تھی یا ان کو ایک الگ دفعہ میں داخل کرنا چاہیے تھا۔ قدیم فقہ میں ان کو موجبات تفریق میں اس لیے شمار نہیں کیا گیا تھا کہ یہ اسلامی تعزیرات کی رو سے جرائم مستلزم سزا تھے، مگر آج کل کی تعزیرات میں ان افعال کی روک تھام کے لیے کوئی انتظام نہیں ہے اور ان کا شیوع عام ہے، اس لیے ان کو موجبات تفریق میں داخل ہونا چاہیے۔

خطرناک امراض میں سے صرف جذام، برص اور جنون کو لیا گیا ہے اور ان کے سوا دوسرے تمام خطرناک امراض کو چھوڑ دیا گیا ہے، حالانکہ وہ نفرت انگیز اور ضرر رساں ہونے میں کسی طرح ان تینوں بیماریوں سے کم نہیں ہیں۔ اس کی وجہ اگر محض یہ ہے کہ فقہ مالکی میں دوسرے امراض کی تصریح نہیں ہے تو ہم اس کو تقلید جامد کہینگے، اس کا نام تفقہ نہیں ہے۔ اگر یہ تینوں امراض بذات خود وجہ فسخ ہیں تو اس کے لیے کوئی نص قطعی ہونی چاہیے، اور اگر ان کے وجہ فسخ ہونے کی علت موجب ضرر شدید ہونا ہے، تو جن جن امراض میں یہ علت پائی جائے ان سب کو اس فہرست میں شامل ہونا چاہیے۔ آخر دق، سل، آتشک، سوزاک، دمہ، ہیضہ، ابنہ، عذیوط اور بعض دوسرے امراض کس حیثیت سے جذام اور

برص کے مقابلہ میں کم خطرناک اور موجب اذیت روحانی وجسمانی ہونے میں کم تر سمجھے جا سکتے ہیں ۹
حسب ذیل مسائل کے متعلق تجویز کیا گیا ہے کہ ان کا فیصلہ فقہ حنفی کے مطابق کیا جائے۔

(۱) خیار بلوغ۔

(۲) نکاح فاسد منعقد ہونا یا بعد میں کسی وجہ سے فاسد ہو جانا۔

(۳) شوہر کا عنین یا مجبوب ہونا۔

(۴) کوئی اور وجہ جو بروئے فقہ حنفی فسخ نکاح کے لیئے کافی ہو۔

ان دفعات کے اختصار کو دیکھ کر اور بھی زیادہ حیرت ہوتی ہے۔ ایک جدید مسودۂ قانون مرتب کرنے کی ضرورت ہی اس وجہ سے پیش آئی تھی کہ انگریزی عدالتوں میں جو محمڈن لا رائج ہے اس میں مفسدات نکاح اور وجوہ فسخ نکاح کی پوری اور صحیح تفصیل موجود نہیں ہے ایسی حالت میں فقرہ نمبر (۲) اور فقرہ نمبر (۴) سے کیا فائدہ حاصل ہو سکتا ہے؟ نتیجہ پھر بھی وہی ہوگا کہ محمڈن لا کی کتابوں اور عدالتہائے عالیہ کے فیصلوں کی طرف رجوع کیا جائیگا اور وکلاء اپنے منشاء کے مطابق حضرات علماء سے بالکل متضاد فتوے حاصل کر کے عدالتوں میں قانون اسلام کا مذاق اڑواتے رہیں گے۔

اس مسودّے کی ترتیب میں جو روش اختیار کی گئی ہے اس کو دیکھ کر شبہہ ہوتا ہے کہ ہمارے علماء دین کو یا تو ان ذمہ داریوں کا احساس نہیں ہے جو مسلمانوں کے اولی الامر ہونے کی حیثیت سے ان پر عائد ہوتی ہیں، یا وہ ان کو جاننے کے باوجود ادا کرنے سے پہلو تہی کر رہے ہیں۔ جیسا کہ ہم بارہا کہہ چکے ہیں اولی الامر کا کام صرف اتنا ہی نہیں ہے کہ فقہ کی قدیم کتابوں سے جزئیات نقل کر دیا کریں، بلکہ ان کا اصلی کام یہ ہے کہ شریعت کے اصول کو سمجھ کر اور احکام خدا و رسول کے مقاصد و مصالح پر نظر رکھ کر اپنے زمانے کی ضرورتوں کے مطابق پچھلے قوانین میں ترمیم و اصلاح کرتے رہیں، اور حسب ضرورت نئے قوانین بھی وضع کریں۔ سوسائٹی کی حالت ہر زمانے میں یکساں نہیں رہتی۔ اخلاقی، دینی، اجتماعی، معاشی اور سیاسی حالات میں ہمیشہ تغیر واقع ہوتا رہتا ہے اور

ان تغیرات سے نئی نئی قانونی ضرورتیں پیدا ہوتی رہتی ہیں۔ اگر قانون تغیرات کے ساتھ ساتھ حرکت کرکے اور نئی پیدا ہونے والی ضرورتوں کو پورا نہ کرسکے، تو بہت جلدی وہ زائد المیعاد ہو جائیگا۔ اسی غرض کے لیے شارع نے اولی الامر کو قانون سازی کے اختیارات دیے ہیں تاکہ زمانے کے متغیر حالات میں اسلامی جماعت کو اصول شریعت کا پابند رکھنے اور ان کی اجتماعی و انفرادی زندگی کو مقاصد شریعت کے مطابق منظم کرنے کے لیے جیسے جیسے قوانین کی ضرورت ہو، ان کو خود باہمی مشورے سے وضع کرتے رہیں۔ ابتدائے اسلام کے اولی الامر نے ان اختیارات سے فائدہ اٹھایا اور اپنے زمانے میں جن قوانین کی ضرورت محسوس کی، ان کو اپنے اجتہاد سے کام لے کر وضع کیا۔ وہ اس کے لیے مکلف نہ تھے اور نہ ان کے پاس یہ معلوم کرنے کا کوئی ذریعہ تھا کہ ہزار برس بعد ہندوستان میں انگریزی حکومت قائم ہوگی، اور اسلامی تہذیب کا سارا نظام مضمحل ہو جانے اور ایک نئے تمدن کے پھیل جانے سے مسلم سوسائٹی کی کیا حالت ہوگی اور اس حالت میں مقاصد شریعت کے مطابق مسلمانوں کے معاملات کی تنظیم اور ان کے دین و اخلاق کی حفاظت کیلئے کن قانونی تدابیر کی ضرورت ہوگی۔ ایسے حالات کے لیے قوانین بنانا ان کا کام نہ تھا نہ وہ بنا سکتے تھے۔ یہ کام اس زمانے کے اولی الامر کا ہے اور انہی پر یہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔ اگر اس وقت ناکافی قوانین کی وجہ سے مسلمانوں کے معاملات خراب ہوں، اور ان میں اخلاقی مفاسد پھیلیں اور ان کے درمیان ظلم و جور کی اشاعت ہو، تو اس کا بار پانسو برس پہلے کے اولی الامر خدا کے سامنے جواب دہ نہ ہونگے، بلکہ اسی زمانے کے اولی الامر ہوں گے۔

قوانین فقہی میں اصلاح و ترمیم اور جدید قانون سازی کی ضرورت اتنی بیّن ہے کہ اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ آج سے دو سو برس پہلے تک جو تمدنی حالت دنیا میں تھی اس میں ایک مفقود الخبر شخص کی جستجو کرنا بہت مشکل تھا اور برس دو برس کی تلاش بھی کافی نہ تھی۔ مگر آج ریل، تار، اخبارات اور بین الاقوامی تعلقات کی آسانیوں نے حالات بالکل بدل دیے ہیں۔ اب چند ہفتوں میں اس امر کا ظن غالب حاصل ہو سکتا ہے کہ مفقود یا تو مر گیا ہے یا شرارت سے اس نے اپنی شخصیت کو قصداً چھپا دیا ہے۔

تمدنی حالات کی تبدیلی سے مفقود الخبر کے احکام الگ الگ بیان کیے گئے ہیں، اگرچہ

اس پرانی بین الاقوامی تقسیم کے مطابق قانون نافذ کیا جائے تو مسلمانوں کو سخت دقتیں پیش آئیں گی۔ لامحالہ ہم کو مفقود الخبر کی حد تک قانون کی تعبیر اس طرح کرنی پڑے گی کہ ہر وہ شخص مفقود دارالاسلام کے حکم میں ہے جو دنیا میں کہیں ہو، خواہ وہ امریکہ، جاپان اور جرمنی میں ہو، یا ترکی، مصر اور عراق میں۔

فقہائے متقدمین نے لعان سے انکار کرنے والے مرد کے لیے حد قذف یا حبس کی سزا تجویز کی تھی۔ اسی طرح لعان سے انکار کرنے والی عورت کے لیے وہ حد زنا یا حبس تجویز کرتے تھے۔ مگر آج ہندوستان میں یہ ممکن نہیں۔ لامحالہ ہم کو فریقین کے حقوق کی حفاظت کے لیے دوسری قانونی تدبیریں تجویز کرنی پڑیں گی جنکو موجودہ حالات میں روبعمل لایا جاسکتا ہو۔

قدیم زمانے میں عام طور پر مسلم سوسائٹی اور خصوصاً مسلمان عورتوں کا معیار اخلاق بہت بلند تھا۔ اسلامی تعلیمات ان کے رگ و پے میں راسخ تھیں۔ اسلامی حکومت موجود تھی۔ اسلام کے تعزیری اور اصلاحی قوانین نافذ تھے۔ اخلاق عامہ کی حفاظت کے لیے سخت انتظامات تھے۔ اُس زمانے کے فقہاء ان حالات کا تصور بھی نہ کر سکتے تھے جو اس وقت ہندوستان میں انگریزی حکومت، مغربی تمدن، غیر مسلم اکثریت، جدید علوم اور ادبیات کی اشاعت اور طریق تربیت کی خرابیوں سے پیدا ہو گئے ہیں۔ اُنہوں نے فسخ و تفریق کے لیے جو قوانین بنائے تھے وہ اُس زمانہ کی اجتماعی حالت کے لیے مناسب ہو سکتے تھے مگر آج مسلمانوں کی معاشرت کو مقاصد شریعت کے مطابق پاکیزگی کے کم سے کم معیار پر قائم رکھنے کے لیے بھی وہ قوانین کافی نہیں ہیں۔ اس زمانے کے اولی الامر کا فرض یہ ہے کہ وہ اس وقت کی مسلم سوسائٹی کے حالات کو دیکھیں جو خرابیاں عام طور پر پھیلی ہوئی ہیں انکے اسباب کی تحقیق کریں، اور ان کی اصلاح کے لیے ایسی قانونی تدبیریں اختیار کریں جو موجودہ طرز حکومت کے ماتحت اختیار کی جا سکتی ہیں۔ ان حالات کیلیے جزئی قوانین وضع کرنا ۱۲ سو برس پہلے کے فقہاء کا فرض نہ تھا، وہ غیب دان نہ تھے کہ ان پر قیامت تک کے تغیرات احوال روشن ہوتے، نہ وہ خداوند علیم و حکیم کی سی بصیرت رکھتے تھے کہ قرآنی احکام کی طرح جامع احکام وضع کر سکتے۔ اگر اس زمانے کے ہندوستانی اولی الامر صرف اُنہی جزئیات پر انحصار کریں گے جو ہزار بارہ سو برس پہلے کے فقہاء وضع کر گئے ہیں تو وہ اپنے فرض سے ہرگز سبکدوش نہ ہو سکیں گے۔

عموماً ہمارے علماء اس غلطی میں مبتلا ہیں کہ خدا و رسول کے احکام اور ائمہ مجتہدین کے اجتہادات میں فرق نہیں کرتے

وہ ان دونوں کے مجموعے کا نام "شریعت" رکھتے ہیں، اور اس مجموعی "شریعت" کو دائمی، اور ناقابل بحث و تنقید اور ناقابل حذف و اضافہ قرار دیتے ہیں۔ جہاں کسی نے فقہی مسائل پر تنقید کی یا ان میں حذف و اضافہ کی ضرورت ظاہر کی، اور انہوں نے یہ کہہ کر ان کا منہ بند کر دیا کہ "شریعت" ایک دائمی قانون ہے، اس میں قیامت تک ترمیم ہو سکتی ہے، نہ کوئی اضافہ کیا جا سکتا ہے حالانکہ در اصل شریعت کا اطلاق صرف قرآن مجید کے احکام اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے قول و عمل پر ہوتا ہے یہی چیز دائمی ہے اور بلاشبہہ اس میں ترمیم و اصلاح کی قیامت تک ضرورت نہیں ہے، کیونکہ یہ الٰہی علم و بصیرت پر مبنی ہے، اور زمان و مکان کے جملہ تغیرات میں یکساں قابل عمل ہے لیکن اس شریعت کے اصول سے جو اجتہادی احکام ائمہ سلف نے مستنبط کیے ہیں وہ "شریعت" نہیں ہیں، بلکہ اصطلاحی زبان میں "قوانین" ہیں۔ ان کے متعلق یہ گمان کرنا ہرگز درست نہیں کہ وہ بھی شریعت کی طرح دائمی اور ناقابل حذف و اضافہ ہیں۔ یہ گمان کرنے کے لیے کوئی بنیاد اس کے سوا نہیں ہو سکتی کہ معاذ اللہ ائمہ مجتہدین کو علم کے اعتبار سے خدا یا رسول خدا کا ہم پلہ سمجھا جائے، اور جب یہ غلط ہے تو ان کے وضع کیے ہوئے قوانین کو تنقید سے بالاتر قرار دینا اور ان پر اضافہ کو غیر ممکن سمجھنا بھی غلط ہے۔

علمائے کرام سو برس سے اسی غلطی کا ارتکاب کر رہے ہیں۔ تغیر پذیر زمانے کی ہر ضرورت کے موقع پر جب کبھی مسلمانوں نے اجتہادی احکام میں ترمیم و اضافہ کی درخواست کی، علماء نے ان کو یہی کہہ کر خاموش کر دیا کہ یہ اللہ کی دائمی شریعت ہے۔ اول اول مسلمان "شریعت" کا نام سن کر دم بخود ہو گئے، مگر تلخ حقائق کی یہ وسیع دنیا جو حجروں اور خانقاہوں کے باہر آباد ہے اپنے نت نئے مطالبات سے کب تک باز رہ سکتی تھی؟ رفتہ رفتہ مسلمانوں میں یہ غلط خیال پیدا ہو گیا کہ وہ قانون جو اپنی نمایاں کوتاہیوں کے باوجود اپنے نمائندوں کی زبان سے غیر تغیر پذیر ہونے کا دعویٰ کر رہا ہے، اسی کا نام شریعت ہے چنانچہ وہ پوری شریعت کا جوا اپنے کندھوں سے اتار پھینکنے پر آمادہ ہو گئے، کیونکہ احکام خدا و رسول اور اجتہادات ائمہ کے درمیان اصولی فرق و امتیاز سے وہ بیگانہ تھے، اور علماء نے ان کو اور بھی زیادہ بیگانہ کر دیا تھا۔ ترکی میں یہ ہو چکا ہے ایران میں ہو رہا ہے، افغانستان بھی عنقریب اسی راستہ پر جاتا نظر آتا ہے۔ اب اگر ہماری قومی کشتی کے کھیون ہاروں کا یہی حال ہے جو ہم دیکھ رہے ہیں تو ہندوستان کا بھی خدا ہی حافظ ہے۔

مقالات

حقوق الزوجین

(۶)

عیوب میں خیار فسخ | عیوب زوجین کے مسئلہ میں فقہاء کے درمیان بکثرت اختلافات ہوئے ہیں ایک گروہ اس طرف گیا ہے کہ عورت اور مرد کے کسی عیب کی بنا پر دوسرے فریق کو خیار فسخ نہیں ہے۔ چنانچہ درمختار میں ہے ولا یتخیر احد الزوجین بعیب الاخر ولو فاحشاً کجنون و جذام و برص و رتق و قرن (یعنی میاں اور بیوی میں سے کسی کو بھی دوسرے کے کسی عیب پر فسخ نکاح کا اختیار نہیں، خواہ وہ عیب کیسا ہی سخت ہو، مثلاً جنون، جذام، برص، رتق اور قرن) صحابہ میں سے حضرت علی اور ابن مسعودؓ اور ائمہ مجتہدین میں سے عطاء، نخعی، عمر ابن عبدالعزیزؒ، ابن ابی لیلیٰ، اوزاعی، ثوری، ابو حنیفہ اور ابو یوسف رضی اللہ عنہم کا یہی مذہب ہے۔

دوسرا گروہ کہتا ہے کہ تمام ایسے عیوب جو مانع تعلقات زن و شوہر ہوں، ان میں عورت اور مرد دونوں کو خیار فسخ ہے، مثلاً جنون، جذام، برص، گندہ دہنی، امراض خبیثہ اور شرمگاہ کے ایسے عوارض جو مانع قربت ہوں (یہ امام مالک کا مذہب ہے، چنانچہ ابن جزی نے القوانین میں عیوب مذکورہ بالا کی تفصیل بیان کرنے کے بعد تصریح کی ہے کہ اذا کان فی احد الزوجین احد العیوب کان للاخر الخیار فی البقاء معہ والفراق۔

امام شافعی کے نزدیک جنون، جذام اور برص میں عورت اور مرد دونوں کو خیار فسخ ہے۔

مگر قروح سیالہ فرج مثلاً آتشک وغیرہ، اور گندہ دہنی اور خارشت میں خیار نہیں ہے۔ البتہ اگر عورت امام مالکؒ کے نزدیک ایسے امراض میں مبتلا ہو جو مانع مباشرت ہوں، یا مرد عنین، یا مقطوع الذکر ہو تو ایسی صورت میں فریق ثانی کو خیار فسخ ہے۔

امام محمدؒ کے نزدیک شوہر کو عورت کے کسی عیب کی بنا پر خیار فسخ نہیں ہے۔ مگر عورت کو شوہر کے جنون اور جذام اور برص میں خیار فسخ ہے۔

ان تمام مذاہب میں سے دوسرا مذہب قرآن مجید کی تعلیم سے اقرب ہے۔ قرآن کی رو سے عورت اور مرد کے ازدواجی تعلق میں دو چیزوں کو مقصدی اہمیت حاصل ہے۔ ایک تحفظ اخلاق دوسرے زوجین کی باہمی مودت و رحمت۔ یہ دونوں مقصد ایسے عیوب میں فوت ہو جاتے ہیں جن سے زوجین طبعاً ایک دوسرے سے نفرت کرنے پر مجبور ہوں، یا ایک دوسرے کی طبیعی خواہشات کو پورا نہ کرسکتے ہوں۔ پھر جیسا کہ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں، یہ بات اسلامی قانون ازدواج کے اصول میں سے ہے کہ ازدواجی تعلق زوجین کے لیے مضرت اور حدود اللہ سے تجاوز کا موجب نہ ہونا چاہیے۔ یہ قاعدہ بھی ان عیوب میں خیار فسخ نہ رکھنے سے ٹوٹ جاتا ہے۔ وہ تمام امراض جن کا اوپر ذکر کیا گیا ہے، ضرر پہونچانے والے ہیں اور ان سے اس امر کا بھی خوف ہے کہ زوجین میں سے کوئی ایک نفرت کی وجہ سے یا اپنی طبیعی خواہشات پوری نہ ہونے کی وجہ سے حدود اللہ کو توڑ دیگا۔ اس لیے ضروری ہے کہ ان تمام عیوب میں زوجین کے لیے خیار فسخ رکھا جائے۔

یہ تو اُس صورت میں ہے جبکہ نکاح سے پہلے زوجین کو ایک دوسرے کے حال کی خبر نہ ہو اور بعد میں علم ہوتے ہی اس پر ناراضامندی کا اظہار کر دیں۔ رہی یہ صورت کہ زوجین کو نکاح سے پہلے ایک دوسرے کا حال معلوم تھا اور انہوں نے جان بوجھ کر نکاح کر لیا، یا ان کو معلوم تو نہ تھا، مگر بعد میں علم ہونے پر انہوں نے خیار فسخ استعمال نہ کیا، یا نکاح کے بعد عیب پیدا ہوا، تو ان تمام صورتوں میں مرد کے

پاس تو ایک چارۂ کار ایسا موجود ہے جس سے وہ ہر وقت کام لے سکتا ہے، یعنی طلاق۔ اور اس کے علاوہ دوسرا چارۂ کار بھی اس کے پاس موجود ہے یعنی دوسری شادی کر لینا مگر عورت کے لیے بعض صورتوں میں فقہاء نے کوئی چارہ کار تجویز نہیں کیا ہے اور بعض صورتوں میں کسی نے اس کی خلاصی کی تدبیر نکالی ہے اور کسی نے نہیں نکالی۔ اس باب میں جو فتاوی ہیں۔ اُن کو ہم علیحدہ علیحدہ بیان کر کے ان پر بحث کریں گے

عنین و مجبوب وغیرہ اگر شوہر مجبوب (مقطوع الذکر) ہو تو اس بات پر قریب قریب سب کا اتفاق ہے کہ عورت کو تفریق کا دعویٰ کرنے کا حق ہے، اور تحقیق حال کے بعد فی الفور تفریق کرا دی جائیگی۔

اگر شوہر نامرد ہو اور عورت تفریق کا مطالبہ کرے، تو حضرت عمر کے فیصلہ کی بنا پر اسے ایک سال تک علاج کی مہلت دی جائیگی اس کے بعد بھی اگر وہ قادر نہ ہوا تو تفریق کرا دی جائیگی لیکن اسکے ساتھ فقہاء نے حسب ذیل شرطیں لگائی ہیں

(۱) عورت کو پہلے سے اس کے عنین کا علم نہ ہو۔ اگر اس کو علم تھا اور اس نے برضا و رغبت اس سے نکاح کیا تو اُسے تفریق کے مطالبہ کا حق نہیں۔

(۲) اگر عورت کو پہلے علم نہ تھا، مگر بعد میں علم ہونے کے بعد اس نے اس کے نکاح میں رہنے پر رضامندی کی تصریح کر دی تب بھی اس کو مطالبۂ تفریق کا حق باقی نہیں رہا۔

(۳) مرد ایک مرتبہ بھی مباشرت پر قادر نہ ہوا ہو۔ اگر اس نے ایک مرتبہ بھی مباشرت کر لی، خواہ وہ ادھوری ہی کیوں نہ ہو، تب بھی عورت تفریق کا حق نہیں رکھتی۔

ہمارے نزدیک یہ تینوں شرطیں درست نہیں ہیں۔ اگر کسی عورت نے قصداً اپنی حماقت سے کسی شخص کو عنین جانتے ہوئے اس سے نکاح کر لیا، تو اس کی یہ سزا معقول اور مناسب نہیں ہے کہ اس کو تمام عمر ایک نامرد شوہر کے ساتھ زندگی گذارنے پر مجبور کیا جائے۔ اس کے مفاسد اس قدر بین ہیں کہ بیان کی حاجت نہیں۔ ایسی نادان عورت کے لیے بس اسی قدر سزا کافی ہے کہ اس کو مہر سے محروم کر کے تفریق کرا دی جائے۔

اگر عورت کو نکاح کے بعد شوہر کے نامرد ہونے کا علم ہوا اور اس نے ابتداءً اس کے ساتھ رہنے پر اپنی رضامندی کی تصریح کر دی، تو یہ کوئی ایسا قصور نہیں ہے جس کی بنا پر اس کو تمام عمر معصیت کی زندگی گذارنے پر مجبور کیا جائے۔ ایک ناتجربہ کار دوشیزہ ابتدا میں ان فطری تکلیفوں کا اندازہ نہیں کر سکتی جو ایک عنین کی بیوی کو پیش آتی ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ وہ اپنی نیک طبعی کی بنا پر یہ خیال کرے کہ شوہر اگر عنین ہے تو کیا ہے، میں اسی طرح اس کے ساتھ زندگی بسر کر لوں گی۔ مگر بعد میں اس کو وہ ناقابل برداشت تکلیفیں پیش آئیں جن کا اسے پہلے سے حساب نہ تھا، اور وہ اپنی صحت کی خرابی یا مبتلائے معصیت ہونے کے خوف سے پریشان ہو کر تفریق کی خواہش کرے۔ کیا ایسی صورت میں یہ جائز ہوگا کہ اس کی پہلی رضامندی کو سند قرار دیکر اس کی زبان پکڑی جائے اور اس سے کہا جائے کہ تو نے ابتدا میں جو غلطی کی تھی اس کی یہی سزا ہے کہ اب تو سڑ سڑ کر مرجا، یا آبرو باختہ بن کر زندگی گذار؟ جہاں تک ہم غور کرتے ہیں، یہ بات قرآن مجید کی تعلیم کے خلاف ہے، اور اس سے ایسے نقصانات پیدا ہونے کا امکان ہے جو اس عورت کی ذات ہی تک محدود نہ ہوں گے بلکہ سوسائٹی میں پھیلیں گے اور نسلوں تک منتقل ہوں گے۔ اتنے بڑے نقصان کو گوارا کرنے سے زیادہ بہتر یہ ہے کہ ایک شخص کے نقصان کو گوارا کیا جائے درآں حالیکہ حقیقۃً تفریق میں اس کا کوئی نقصان بھی نہیں ہے۔ زیادہ سے زیادہ اگر کوئی سزا اس غلطی کی اس عورت کو دی جا سکتی ہے تو وہ بس یہی ہے کہ اسے کل یا جزء مہر سے محروم کر دیا جائے۔

تیسری شرط بھی ہمارے خیال میں بہت سخت ہے۔ نکاح سے شریعت کا جو مقصد ہے وہ اس قسم کے ازدواجی تعلق سے ہرگز پورا نہیں ہوتا۔ اسلام کا قانون کسی آسمانی مخلوق کے لیے نہیں ہے، بلکہ عام انسانوں کے لیے ہے۔ اور عام انسانوں میں جو عورتیں پائی جاتی ہیں ان کے لیے اگر یہ ناممکن نہیں تو غایت درجہ دشوار ضرور ہے کہ ایک یا چند مدت شوہر کی صحبت [illegible]

متمتع ہو جانا ان کے لیے کافی ہو، اور اس کے بعد مدت العمر اس سے محروم رہ کر وہ ہنسی خوشی گذار دیں اور اپنی عصمت کو ہر قسم کے خطرات سے محفوظ رکھیں۔ بالفرض اگر پچاس فی صدی عورتیں بھی اس پر قادر ہوں، تو ان بقیہ پچاس فی صدی عورتوں کا حشر ہوگا جن کے ضبط و تحمل اور پاکیزگی اخلاق کا مرتبہ اتنا بلند نہیں ہے؟ کیا ان کے مبتلائے معصیت ہونے اور سوسائٹی میں ان کی وجہ سے طرح طرح کے مفاسد پھیلنے کی ذمہ داری اُس قانون پر نہ ہوگی جس نے ان کے لیے حلال کے دروازے بند کر کے انھیں حرام کے راستوں پر چلنے کے لئے مجبور کر دیا؟ پس ہماری رائے میں عنت کی ہر شکایت پر، خواہ وہ نکاح سے پہلے کی ہو یا بعد میں حادث ہوئی ہو، عورت کو عدالت کی طرف رجوع کرنے کا حق ہونا چاہیے، اور اگر کافی علاج کے بعد جس کے لیے ایک سال کی مدت مناسب ہے، یہ شکایت دور نہ ہو تو تفریق کرا دینی چاہیے۔

فقہائے کرام نے یہ بھی لکھا ہے کہ اگر ایک سال تک علاج کرانے کے بعد شوہر نے ایک مرتبہ بھی مباشرت کر لی، خواہ وہ ادھوری ہی کیوں نہ ہو، تو عورت کا حق تفریق ہمیشہ کے لیے باطل ہو جائے گا۔ یہاں پھر بیجا شدت پائی جاتی ہے۔ زیادہ مناسب یہ ہے کہ اس معاملہ میں ماہرین طب کی رائے پر اعتماد کیا جائے۔ اگر علاج کے بعد بھی ماہرین کی رائے یہ ہو کہ مریض، وظیفۂ زوجیت ادا کرنے کے لیے پوری طرح اہل نہیں ہو سکا ہے تو تفریق کرا دینی چاہیے۔

فقہا نے خصی کے لیے وہی قانون رکھا ہے جو عنین کے لیے رکھا گیا ہے، یعنی اس کو بھی علاج کے لیے ایک سال کی مہلت دی جائے گی۔ اس کی وجہ یہ بتائی گئی ہے کہ اس کے مباشرت پر قادر ہونے کی امید کی جا سکتی ہے (کما فی الہدایہ) لیکن طبی تحقیقات سے یہ ثابت ہو چکا ہے کہ اس معاملہ میں خصی اور مجبوب کے درمیان کوئی فرق نہیں ہے۔ مرد خواہ مقطوع الذکر ہو یا مقطوع الخصیتین، دونوں صورتوں میں وظیفۂ زوجیت کے لیے وہ یکساں نااہل ہوتا ہے،

اور کوئی علاج اس کی کھوئی ہوئی اہلیت کو واپس نہیں لا سکتا۔ لہٰذا خصی اور مجبوب کے حق میں ایک ہی قانون ہونا چاہیئے۔

جنون مجنون کے بارے میں حضرت عمرؓ کا فیصلہ یہ ہے کہ اس کے علاج کے لیے ایک سال کی مدت مقرر کی جائے، اگر اس مدت میں وہ درست نہ ہو تو اس کی عورت اس سے جدا کر دی جائے فقہاء نے اسی فیصلہ کو لیا ہے، اور مختلف طریقوں سے جزئیات میں اس حکم کو جاری کیا ہے۔ امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک یہ حکم صرف اس مجنون کے لیے ہے جو نکاح سے قبل مجنون تھا اور نکاح کے بعد ہم بستری پر قادر نہ ہوا۔ اس لحاظ سے گویا وہ عنین ہے اور اسی لیے اس کو ایک سال کی مہلت دی جاتی ہے۔ امام محمدؒ رحمۃ اللہ کی رائے میں جنون اگر حادث ہو تو اس کو علاج کے لیے ایک سال کی مہلت دی جائے گی۔ اور اگر مطبق ہو تو وہ مجبوب کے حکم میں ہے۔ بلا تاجیل تفریق کرا دی جائے گی۔ امام مالک رضی اللہ عنہ کے نزدیک حادث اور مطبق دونوں میں ایک سال کی مہلت بغرض علاج دی جائے گی، اور اگر اس مدت میں وہ درست نہ ہو تو تفریق کرا دی جائے گی لیکن اس کے ساتھ فقہائے مالکیہ حسب ذیل شرطیں لگاتے ہیں:۔

(۱) اگر نکاح سے پہلے وہ مجنون تھا اور عورت نے جان بوجھ کر اس سے نکاح کیا تو وہ تفریق کا مطالبہ نہیں کر سکتی۔

(۲) اگر نکاح کے بعد اسے معلوم ہوا کہ وہ مجنون ہے اور اس نے بصراحت اس کے ساتھ رہنے پر رضامندی ظاہر کر دی تب بھی تفریق کا حق باقی نہ رہا

(۳) اگر جنون نکاح کے بعد پیدا ہوا ہو تو عورت صرف اس صورت میں تفریق کا مطالبہ کر سکتی ہے کہ جنون پیدا ہونے کے بعد اس نے اس کے ساتھ رہنے پر رضامندی کی تصریح نہ کی ہو۔ اور اپنے اختیار و رضامندی سے اس کو مباشرت یا دواعی مباشرت کا موقع نہ دیا ہو۔

یہ شرطیں اسی نوعیت کی ہیں جن کا ذکر عنین کے باب میں گذر چکا ہے اور ان پر بھی ہم کو وہی اعتراض ہے۔ شریعت تمدن اور اخلاق کے مقاصد ایسی صورت میں کبھی پورے نہیں ہوسکتے کہ کسی عورت کو ایک پاگل شخص کے ساتھ زبردستی باندھ رکھا جائے۔ اگر اس نے جان بوجھ کر اس سے نکاح کیا تو اس کے لیے یہ سزا کافی ہے کہ اس کو مہر سے محروم کر دیا جائے۔ اگر نکاح ہو جانے کے بعد اسے جنون کا علم ہوا اور اس نے ابتداءً اس پاگل کے ساتھ زندگی بسر کرنے کا ارادہ ظاہر کر دیا لیکن بعد میں اس کے لیے روحانی و جسمانی تکلیفیں ناقابل برداشت ہوگئیں تو درحقیقت اس نے کوئی ایسا جرم ہی نہیں کیا جس کی سزا اس کو یہ دی جائے کہ تمام عمر وہ ایک پاگل کے ساتھ رنج، تکلیف اور خطرات سے بھری ہوئی زندگی گذارنے پر مجبور کی جائے۔ اگر نکاح کے بعد جنون پیدا ہوا اور ابتدائی حالت جنون میں عورت نے وفاداری اور رفاقت کے شریفانہ جذبات کی بنا پر اس کو چھوڑنا پسند نہ کیا اور حتی الامکان اس کی خدمت کی، اور سابق کا سا تعلق زن و شوہری اس کے ساتھ رکھنا گوارا کر لیا تو اس سے یہ کیوں لازم آجائے کہ جب اس کا پاگل پن اس بیچاری کے لیے ناقابل برداشت ہو چکا ہو اس وقت بھی اس کو رہائی دلانے سے انکار کر دیا جائے؟ کیا یہ قید لگانے سے قانون کا منشا یہ ہے کہ جوں ہی کسی عورت کے شوہر میں آثار جنون ہویدا ہوں وہ فوراً اس کی تمام پچھلی محبتیں اور رفاقتیں فراموش کر کے اس کے ساتھ بے وفائی اختیار کر لے اور اس کو چھوڑ کر چلی جائے، اس خوف سے کہ اگر بعد میں اس جنون نے مستقل ناقابل برداشت صورت اختیار کر لی تو اس وقت کی وفاداری و رفاقت وبال جان ثابت ہوگی اور اس کا بہت برا خمیازہ بھگتنا پڑے گا؟

اس قسم کی شرطیں عائد کرنے میں عورتوں کے ساتھ بہت سختی کی گئی ہے۔ عورت اگر بیکار ... یا جنون میں مبتلا ہو، یا کسی نفرت انگیز یا مضرت رساں مرض میں مبتلا ہو تو مرد اسے

طلاق دے سکتا ہے۔ یا دوسری شادی کرکے اپنی زندگی خوشگوار طریقہ سے بسر کرسکتا ہے لیکن عورت ان حالات میں سے کسی حالت میں مبتلا ہو تو عورت : تو اسے طلاق دے سکتی ہے، نہ اس کی موجودگی میں دوسری شادی کرسکتی ہے۔ اس کے لیے بجز تفریق کے کوئی چارۂ کار نہیں ہے۔ اب اگر اس ایک چارۂ کار پر بھی ایسی پابندیاں عائد کردی جائیں جن کی وجہ سے اکثر و بیشتر حالات میں اس کے لیے مخلصی کی کوئی صورت باقی ہی نہ رہے تو یہ اس عدل اور توازن کے خلاف ہوگا جو اسلامی قانون کی خصوصیات میں سے ہے۔ ایسے تمام معاملات میں قرآن مجید کی وہ آیات ہمارے لیے دلیل راہ ہونی چاہئیں جن میں فرمایا گیا ہے کہ نکاح میں معاشرت بالمعروف ہونی چاہیے، عورت کو مرد کے نکاح میں رکھا جائے تو اس طرح کہ اس میں ضرار اور تعدی نہ ہو، اور حدود اللہ ٹوٹنے کا خوف نہ ہو۔ اگر کسی ازدواجی تعلق میں یہ لازمی شرطیں پوری نہ ہوں تو تسریح باحسان کے قاعدہ پر عمل ہونا چاہیے۔ کون کہہ سکتا ہے کہ ایک پاگل، یا آتشک زدہ، یا جذامی، یا مبروص شوہر کے ساتھ بجبر و اکراہ بندھے رہنے سے بڑھ کر کسی عورت کے لیے ضرار اور تعدی کی کوئی دوسری صورت بھی ہو سکتی ہے؟ اور کون نہیں سمجھ سکتا کہ جو عورت اس حالت میں بجبر رکھی گئی ہو اس کے لیے حدود اللہ سے تجاوز کرنے کے کس قدر مواقع عملی زندگی میں پیدا ہو سکتے ہیں، اور ان مواقع سے بچنا ایک اوسط درجہ کی عورت کے لیے کس قدر دشوار ہے؟

مفقود الخبر مفقود الخبر کے متعلق قرآن مجید میں کوئی صریح حکم نہیں ہے۔ احادیث میں بھی کوئی معتبر حکم نہیں۔ دارقطنی نے اپنی سنن میں ایک حدیث نقل کی ہے جس کے الفاظ یہ ہیں:۔

قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم امرأۃ المفقود امرأتہ حتی یاتیھا البیان۔ حضور نے فرمایا کہ مفقود کی بیوی اسی کی بیوی ہے جب تک کہ اس کا حال معلوم نہ ہو جائے۔

لیکن یہ حدیث سوار بن مصعب اور محمد بن شرحبیل ہمدانی کے واسطہ سے پہنچی ہے جو

مجروح ہیں۔ ابن شرجبیل کے متعلق ابن ابی حاتم نے لکھا ہے کہ انہ یروی عن المغیرۃ مناکیر اباطیل۔ اور سوار بن مصعب کے متعلق ابن القطان نے لکھا ہے کہ وہ متروکین میں ابن شرجبیل سے زیادہ مشہور ہے۔ پس یہ حدیث ضعیف ناقابل احتجاج ہے۔ علاوہ بریں مفقود کے مسئلہ میں حضرت عمرؓ، حضرت عثمانؓ، حضرت علیؓ، حضرت ابن عباسؓ، حضرت عبداللہ بن مسعودؓ، حضرت عبداللہ بن عمرؓ جیسے اکابر صحابہ کی آراء میں جو اختلاف ہوا ہے وہ اس بات پر دلیل ہے کہ ان حضرات میں سے کسی کو اس حدیث کا علم نہ تھا، اور نہ ان کے عہد میں کسی صحابی کو اس کی خبر تھی، کیونکہ اگر صحابہ میں سے کوئی بھی اس حدیث سے واقف ہوتا تو وہ ان حضرات کے سامنے اسے پیش کر کے اختلاف کو ختم کر دیتا۔ محمد بن شرجبیل اس حدیث کو مغیرۃ بن شعبہ سے روایت کرتے ہیں جو حضرت عمرؓ اور حضرت عثمانؓ کے عہد کی نہایت نمایاں شخصیتوں میں سے ہیں اور گورنری کے اعلیٰ عہدوں پر فائز رہے ہیں۔ کیونکر ممکن ہے کہ ان کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ حدیث معلوم ہوتی اور وہ حضرت عمر و عثمان رضی اللہ عنہما کو اس کے خلاف فیصلہ کرنے دیتے۔ ان وجوہ سے یہ سمجھنا چاہیے کہ مفقود کے بارے میں کوئی حکم منصوص نہیں ہے۔ بلکہ اس کا تعلق کلیۃً اہل علم کے اجتہاد سے ہے۔

صحابہ اور تابعین اور ائمۂ مجتہدین کی آراء اس مسئلہ میں مختلف ہیں۔ حضرت عمرؓ، حضرت عثمانؓ، حضرت ابن عمرؓ، اور حضرت ابن عباسؓ کی رائے یہ ہے کہ مفقود کی بیوی کو چار سال تک انتظار کا حکم دیا جائے۔ یہی رائے سعید بن المسیب، زہری، نخعی، عطاء، مکحول، اور شعبی کی ہے۔ امام مالک نے بھی اسی مذہب کو اختیار کیا ہے اور امام احمد کا میلان بھی اسی کی طرف ہے۔

دوسری جانب حضرت علیؓ اور ابن مسعودؓ ہیں جن کی رائے یہ ہے کہ مفقود الخبر کی بیوی کو اس وقت تک صبر کرنا چاہیے جب تک کہ وہ واپس نہ آئے یا اس کی موت کی تحقیق نہ ہو جائے۔

سفیان ثوری، امام ابو حنیفہ اور امام شافعی رحمہم اللہ نے اسی مذہب کو اختیار کیا ہے۔ انتظار کے لیے حنفیہ یہ قاعدہ تجویز کرتے ہیں کہ جب تک شخص مفقود کے ہم عمر لوگ اس کی بستی یا اس کے ملک میں زندہ ہوں اس وقت تک اس کی بیوی انتظار کرے۔ بعض بزرگوں نے انسان کی زیادہ سے زیادہ عمر کا اعتبار کیا ہے۔ یعنی ایک انسان زیادہ سے زیادہ جس عمر تک پہنچ سکتا ہو تو اس عمر تک مفقود کے پہنچنے کا انتظار کیا جائے۔ مثلاً اگر کوئی شخص ۳۰ سال کی عمر میں مفقود ہوا اس کی بیوی کو بقول بعض ۹۰ سال اور بقول بعض ۷۰ سال اور بقول بعض ۶۰ سال اور بقول بعض ۵۰ یا کم سے کم ۴۰ سال انتظار کرنا پڑے گا، کیونکہ بعض کے نزدیک انسان کی عمر طبعی ۱۲۰ سال ہے اور بعض ۱۰۰ یا ۹۰ یا ۸۰ یا ۷۰ قرار دیتے ہیں۔

اس مسئلہ میں جب ہم قرآن مجید کے اصولی احکام کی طرف رجوع کرتے ہیں تو حضرت عمرؓ اور ان کے متبعین کا مذہب ہم کو صحیح معلوم ہوتا ہے اور وہی اسلامی قانون کی روح اور اس کے عدل اور اس کے توازن اور اس کی فطریت سے مطابقت رکھتا ہے۔ قرآن میں ہم دیکھتے ہیں کہ چار بیویوں کی اجازت دینے کے ساتھ یہ حکم دیا گیا ہے کہ فَلَا تَمِیْلُوْا کُلَّ الْمَیْلِ فَتَذَرُوْھَا کَالْمُعَلَّقَۃِ۔ (ایک بیوی کی طرف بالکل اس طرح نہ جھک جاؤ کہ دوسری بیوی کو معلق چھوڑ دو) اس سے معلوم ہوا کہ قرآن کسی عورت کو معلق چھوڑ دینا پسند نہیں کرتا۔ اور جب وہ شوہر کی موجودگی میں اس کو ناپسند کرتا ہے تو اس کے مفقود ہونے کی صورت میں کیونکر پسند کر سکتا ہے۔ دوسری جگہ شوہروں کو حکم دیا جاتا ہے کہ اگر تم اپنی بیویوں سے ایلاء کرو تو زیادہ سے زیادہ چار مہینے تک ایسا کر سکتے ہو اس کے بعد تم کو طلاق دینا ہوگا یہاں پھر اسلامی قانون کی اسپرٹ یہ معلوم ہوتی ہے کہ کوئی عورت اپنے شوہر کی صحبت سے اتنی مدت تک محروم نہ رکھی جائے کہ اس کے لیے موجب ضرر ہو یا حدود اللہ سے تجاوز کا سبب۔۔

بن جائے۔ پھر ولا تمسکوھن ضرارا فرمایا گیا جس کا منشا صاف طور پر یہ ہے کہ رشتہ ازدواج میں ضرار نہ ہونا چاہیے، اور یہ ظاہر ہے کہ مفقود الخبر کی بیوی کو مدت العمر انتظار کا حکم دینے میں انتہا درجہ کا ضرار ہے۔ اس کے ساتھ وہ آیت بھی قابل غور ہے جس میں فرمایا گیا ہے کہ اگر حدود اللہ کے ٹوٹنے کا خوف ہو تو خلع میں کچھ مضایقہ نہیں یہاں حدود اللہ کی حفاظت کو رشتۂ ازدواج کے قیام پر مقدم رکھا گیا ہے، اور اس سے کون انکار کر سکتا ہے کہ جب عورت کا شوہر برسوں سے مفقود ہو اس کے لیے حدود اللہ پر قائم رہنا نہایت مشکل ہے ان تمام احکام کے اصول اور ان کے مصالح اور ان کی حکمت پر غور کرنے سے یہ بات اچھی طرح سمجھ میں آجاتی ہے کہ مفقود الخبر کی بیوی کو ایک غیر معلوم مدت تک انتظار کا حکم دینا اور اس کو معلق رکھ چھوڑنا درست نہیں ہے۔

مذہب مالکی کے احکام علماء احناف نے انہی وجوہ سے مفقود الخبر کے مسئلہ میں مذہب مالکی کے حکم کے مطابق فتویٰ دینا پسند کیا ہے۔ لہذا اب ہم کو دیکھنا چاہیے کہ اس باب میں مالکیہ کے تفصیلی احکام کیا ہیں۔

مذہب مالکی کے لحاظ سے فقدان زوج کی تین صورتیں ہیں، اور ہر ایک کے احکام جدا جدا ہیں۔

(۱) مفقود نے اپنے پیچھے اتنا مال نہ چھوڑا ہو کہ اس کی بیوی گذر بسر کر سکے۔ اس صورت میں حاکم اس کو انتظار کا حکم نہیں دیگا بلکہ تحقیق حال کے بعد بلا انتظار اس کو باختیار خود طلاق دیدے گا یا اسے اجازت دے گا کہ اپنے اوپر طلاق وارد کر لے[1]۔ شافعی اور حنبلی مذاہب بھی اس مسئلہ

---

[1] تطلیق کے لیے حاکم کے بطور خود طلاق دینے سے زیادہ بہتر یہ ہے کہ وہ عورت کو خود اپنے اوپر طلاق وارد کرنے کی اجازت دے، کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بریرہ سے فرمایا تھا کہ انت املک بنفسک ان شئت اقمت مع زوجک وان شئت فارقتیہ۔ (یعنی تجھے اپنے نفس کا اختیار ہے خواہ اپنے شوہر کے ساتھ رہے یا اس سے جدا ہو جا)

یں مالکی مذہب کی تائید کرتے ہیں، کیونکہ ان کے نزدیک عدم نفقہ بجائے خود تفریق کے لیے کافی وجہ ہے۔

(۲) مفقود نے مال تو چھوڑا ہے، مگر عورت جوان ہے اور اس کو کسی طویل مدت کے لیے معلق رکھ چھوڑنے میں اس کے مبتلائے معصیت ہو جانے کا خوف ہے۔ ایسی صورت میں حاکم اس کو ایک سال یا چھ مہینے یا جس قدر مدت مناسب سمجھے، انتظار کرنے کا حکم دیگا۔ اس باب میں حنبلی مذہب بھی مالکی مذہب کا ہم نوا ہے۔ بلکہ بعض صورتوں میں حنابلہ اور مالکیہ نے بلا انتظار ہی تفریق کو جائز رکھا ہے نیز خوف معصیت کے لیے یہ ضروری نہیں ہے کہ مدعیہ خود منہ پھوڑ کر کہدے کہ مجھے اس شوہر کی قید نکاح سے آزاد کرو ورنہ میں زنا کروں گی۔ بلکہ یہ دیکھنا خود قاضی کا کام ہے کہ جو عورت فقدان زوج کی شکایت لے کر آئی ہے اس کی عمر کیا ہے، کس ماحول میں رہتی ہے، اور دعویٰ کرنے سے پہلے کس قدر مدت شوہر کے انتظار میں گذار چکی ہے۔ ان چیزوں پر نظر کرنے سے وہ خود رائے قائم کر سکتا ہے کہ اس کے اخلاق کی حفاظت کے لیے اُسے مدت انتظار میں کس قدر تخفیف کرنی چاہیے۔

(۳) مفقود نفقہ بھی چھوڑ گیا ہے اور عورت کے مبتلائے معصیت ہونے کا خوف بھی نہیں ہے اس صورت میں پھر چار شقیں پیدا ہوتی ہیں۔

الف۔ اگر مفقود بلاد اسلام میں یا ایسے ممالک میں کھویا گیا ہے جن سے مہذب دنیا کے تعلقات ہیں اور جہاں اس کا پتہ چلانا ممکن ہے، تو اس کی عورت کو چار سال تک انتظار کرنے کا حکم دیا جائیگا۔

ب۔ اگر وہ میدان جنگ میں کھویا گیا ہے تو اس کی تلاش کی امکانی کوشش کرنے کے بعد ایک سال انتظار کیا جائے گا۔

ج۔ اگر وہ کسی اندرونی فساد کے سلسلہ میں کھویا گیا ہے تو فساد ختم ہونے کے بعد اُس کی تلاش کے لیے امکانی کوشش کی جائے گی پھر بلا انتظار اس کی بیوی کو عدت وفات گذارنے کی اجازت دیدی جائے گی۔

د۔ اگر وہ ایسے وحشی ممالک میں کھویا گیا ہے جن سے مہذب دنیا کے تعلقات نہیں ہیں، اور جہاں اس کے تلاش کرنے کا امکان نہیں ہے، تو اس کی بیوی کو مدت تعمیر گذرنے تک انتظار کرنا ہوگا۔ مدت تعمیر کی تعیین میں اختلاف ہے بعض ۷۰ سال کہتے ہیں، بعض ۸۰ سال اور بعض ۷۵ سال لیکن جیسا کہ ہم اوپر بیان کر چکے ہیں، یہ اسی صورت میں ہوگا جب کہ وہ کافی نفقہ چھوڑ گیا ہو، اور عورت کے مبتلائے معصیت ہونے کا بھی خوف نہ ہو۔

علماء احناف عموماً اپنے فتاویٰ میں مذہب مالکی کی ان شرائط کو نظر انداز کر جاتے ہیں اور فقدان زوج کی تمام صورتوں میں چار سال کی مدت انتظار کا فتویٰ دیتے ہیں لیکن یہ درست نہیں ہے خصوصاً موجودہ زمانہ میں جب کہ اخلاقی حالات کو بگاڑنے کے بکثرت اسباب پیدا ہو گئے ہیں ہر فاقد الزوج عورت کے لیے چار سال کی مدت انتظار پر اصرار کرنا مصالح شرعیہ کے بالکل خلاف ہے۔ آج اسلامی سوسائٹی میں وہ زبردست اخلاقی ڈسپلن باقی نہیں رہا ہے جو اسلام کے ابتدائی دور میں تھا، غیر اسلامی قوانین کے رواج نے ان تمام بندشوں سے انسان کو آزاد کر دیا ہے جو شہوات نفس کو قابو میں رکھنے کے لیے اسلام نے قائم کی تھیں، سینما، عریاں تصاویر، عشقیہ ناولوں اور قصوں کے رواج عام اور عورتوں اور مردوں کے آزادانہ میل جول نے جذبات کو متحرک کرنے کے اتنے سامان پیدا کر دیے ہیں کہ کسی شخص کے لیے ضبط نفس اور پرہیزگاری کے ساتھ زندگی بسر کرنا بہت دشوار ہو گیا ہے۔ ایسے حالات میں یہ کہاں تک مناسب ہوگا کہ ایک جوان عورت جب اپنے مفقود الخبر شوہر کی واپسی کا دو تین سال انتظار کرنے کے بعد عاجز آ کر عدالت

میں رجوع کرے تو عدالت اس کو مزید چار سال انتظار کرنے کا حکم دے۔ یہ ایسی سختی ہے جس میں صرف عورتوں ہی کے لیے ضرر نہیں ہے، بلکہ اس کے مضر نتائج تمام قوم میں پھیل جانے کا خوف ہے۔ لہٰذا ہماری تجویز یہ ہے کہ قانون میں مفقود الخبر کے متعلق مذہب مالکی کی تمام شرائط کو شامل کیا جائے اور اجراء احکام میں فاقد الزوج عورت کی عمر، اس کے ماحول اور اس مدت کا مناسب لحاظ کیا جائے جس کو حالت انتظار میں گذارنے کے بعد اس نے عدالت کی طرف رجوع کیا ہو۔

حکم بصورت واپسی مفقود اس سلسلہ میں یہ سوال بھی بحث طلب ہے کہ اگر شوہر مفقود، مدت انتظار کے ختم ہونے کے بعد واپس آئے تو اس کا کیا حکم ہے۔ حضرت عمرؓ کا فیصلہ یہ ہے کہ اگر عورت کے نکاح ثانی سے پہلے اس کا شوہر واپس آگیا تو وہ اسی کو ملے گی، لیکن اگر عورت نکاح کر چکی ہے تو خواہ شوہر ثانی کے ساتھ خلوت ہوئی ہو یا نہ ہوئی ہو، دونوں صورتوں میں شوہر اول کا اس پر کوئی حق نہ رہا۔ امام مالکؒ نے موطا میں حضرت عمرؓ کے اسی قول سے استناد کیا ہے اور یہی مذہب مالکی کا مفتیٰ بہ ہے۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ کا فیصلہ یہ ہے کہ عورت ہر حال میں پہلے شوہر کو واپس ملے گی خواہ دوسرے شوہر نے خلوت ہو چکی ہو اور بچے تک پیدا ہو گئے ہوں۔ مزید براں خلوت ہو چکنے کی صورت میں دوسرے شوہر سے اس عورت کو مہر بھی دلایا جائے گا۔ حنفیہ نے اسی مذہب کو اختیار کیا ہے، اور وہ کہتے ہیں کہ حضرت عمرؓ نے بھی آخر میں حضرت علیؓ کے اس فیصلہ کی طرف رجوع کر لیا تھا۔ لیکن امام مالکؒ کے نزدیک حضرت عمرؓ کا رجوع ثابت نہیں ہے۔ (ملاحظہ ہو موطا باب عدۃ التی تفقد زوجھا۔ اور المغنی لابن قدامہ۔)

حضرت عثمانؓ کا فیصلہ یہ ہے کہ اگر عورت نکاح ثانی کر چکی ہو، پھر شوہر اول واپس آجائے تو اس سے دریافت کیا جائے گا کہ تجھے بیوی چاہیے یا مہر؟ اگر اس نے مہر واپس لینے (یا معاف کرا لینے)

کو پسند کیا تو عورت شوہر ثانی کے پاس چھوڑ دی جائے گی۔ اور اگر وہ بیوی کو واپس لینے پر اصرار کرے تو عورت کو اپنے دوسرے شوہر سے جدا ہو کر عدت طلاق گذارنی ہو گی پھر وہ پہلے شوہر کے حوالہ کر دی جائے گی۔ اور دوسرے شوہر سے اس کو مہر دلایا جائے گا۔ بعض روایات میں حضرت عمرؓ سے بھی اسی طرح کا ایک قول منقول ہے لیکن امام مالک کے نزدیک یہ ثابت نہیں ہے۔

ہمارے نزدیک ان تینوں فیصلوں میں سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا فیصلہ احسن ہے۔ اس لیے کہ اگر نکاح ثانی ہو جانے کے بعد بھی شوہر اول کا حق عورت پر قائم رہے تو اس کا نتیجہ یہ ہو گا کہ کوئی شخص ایسی عورت سے نکاح کرنا پسند نہ کرے گا جس کے متعلق اس کو ہمیشہ یہ کھٹکا لگا ہوا ہو کہ نہ معلوم کب اس کا پہلا شوہر واپس آجائے، اور نہ صرف عورت اس سے چھن جائے، بلکہ اس کو مہر بھی دینا پڑے۔ اور بچے ہو جانے کی صورت میں اس کی اولاد الگ برباد ہو۔ اس قسم کی شرط عائد کرنے میں عورت کے لیے نہایت درجہ کا ضرر ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ ایک طویل اور تھکا دینے والی مدتِ انتظار گذار کر بھی اس کی مصیبت ختم نہ ہو، عدالت سے آزادی کا پروانہ حاصل کرنے کے بعد بھی اس کے پاؤں میں ایک زنجیر پڑی رہے اور اس کو ساری عمر معلق حالت ہی میں رہ کر گذارنی پڑے۔

لعان لعان کے متعلق قرآن مجید کا حکم پہلے بیان ہو چکا ہے یہاں اس کے تفصیلی احکام بیان کئے جاتے ہیں۔

شوہر خواہ اپنی بیوی پر بالفاظ صریح زنا کا الزام لگائے یا اولاد کے متعلق کہے کہ وہ اس کی نہیں ہے دونوں صورتوں میں لعان واجب آتا ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے ایک ایسا مقدمہ پیش ہوا تو آپ نے فریقین کو مخاطب کر کے تین مرتبہ فرمایا:۔ اللہ اعلم ان احد کما کاذب فہل منکما من تائب۔ "اللہ خوب جانتا ہے کہ تم دونوں میں سے ایک جھوٹا ہے، پھر کیا تم میں سے

کوئی توبہ کرے گا؟" جب دونوں نے توبہ سے اعراض کیا تو آپ نے قرآن مجید کی ہدایت کے مطابق پہلے شوہر سے چار قسمیں اس بات پر لیں کہ جو الزام اس نے لگایا ہے وہ صحیح ہے اور پانچویں مرتبہ اس سے یہ کہلوایا کہ اگر وہ جھوٹا ہو تو اس پر خدا کی لعنت۔ پھر اسی طرح چار قسمیں عورت سے لیں کہ جو الزام اس پر لگایا گیا ہے وہ غلط ہے اور پانچویں مرتبہ اس سے کہلوایا کہ اگر یہ الزام صحیح ہو تو اس پر خدا کی لعنت۔ اس کے بعد حضور نے فرمایا ذاکم التفریق بین کل متلاعنین الیٰ یوم القیٰمۃ۔ اذا تفرقا لا یجتمعان ابدًا۔" یہ ہر لعان کرنے والے زوجین کے درمیان قیامت تک کے لیے تفریق ہے اس تفریق کے بعد وہ کبھی جمع نہیں ہو سکتے"۔ شوہر نے عرض کیا کہ جو مال میں نے اس کو مہر میں دیا تھا وہ واپس دلوایا جائے۔ آپ نے جواب دیا لا مال لک۔ ان کنت صدقت علیہا فبما استحللت من فرجها وان کنت کذبت علیہا فذلک ابعد لک منها۔ "مال تجھے نہیں مل سکتا۔ اگر تو نے سچا الزام لگایا ہے تو یہ مال اس تمتع کا معاوضہ ہے جو تو اس سے اٹھا چکا ہے۔ اور اگر تو نے اس پر جھوٹی تہمت لگائی ہے تو مال کی واپسی کا استحقاق تجھ سے اور بھی زیادہ دور ہو گیا"۔

حضور کے اس فیصلہ سے حسب ذیل احکام نکلتے ہیں:۔

(۱) لعان قاضی کے سامنے ہونا چاہئے۔ عورت اور مرد آپس میں یا اپنے رشتہ داروں کے سامنے لعان نہیں کر سکتے۔ نہ ایسے لعان سے تفریق ہو سکتی ہے۔

(۲) لعان سے پہلے قاضی عورت اور مرد دونوں کو موقع دے گا کہ ان میں سے کوئی ایک قصور کا اعتراف کرلے جب دونوں اپنی اپنی بات پر اصرار کریں تب لعان کرایا جائیگا۔

(۳) فریقین کی طرف سے لعان کا فعل تمام ہونے کے بعد قاضی اعلان کریگا کہ ان کے درمیان تفریق کردی گئی۔ جمہور کا خیال ہے کہ لعان سے خود بخود تفریق واقع ہو جاتی ہے لیکن امام ابو حنیفہ کی

رائے یہ ہے کہ تفریق کے لیے حکم حاکم ضروری ہے۔ تمام معتبر احادیث جو اس مسئلہ میں ہم کو پہنچی ہیں امام ابوحنیفہ رضی اللہ عنہ کی تائید کرتی ہیں کیونکہ ہر ایسے مقدمہ میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے لعان کا فعل پورا ہونے کے بعد تفریق کا فیصلہ صادر فرمایا ہے، اور محض ملاعنت کو فرقت کے لیے کافی قرار نہیں دیا ہے۔

(۴) لعان سے جو تفریق کی جاتی ہے وہ ابدی ہے۔ اس کے بعد فریقین اگر دوبارہ نکاح کرنا چاہیں تو نہیں کرسکتے۔ اس معاملہ میں تحلیل کا وہ قانون جاری نہیں ہوتا جو حَتّٰی تَنْکِحَ زَوْجًا غَیْرَہٗ میں بیان کیا گیا ہے۔

(۵) لعان سے مہر ساقط نہیں ہوتا۔ خواہ شوہر کا الزام حقیقت میں صحیح ہو یا غلط، بہر صورت مہر اس کو دینا پڑے گا۔ یا اگر دے چکا ہے تو اس کو واپس مانگنے کا حق نہیں ہے۔

اگر عورت پر الزام لگانے کے بعد شوہر لعان کرنے سے انکار کرے تو جمہور کی رائے میں اس پر حد قذف جاری کی جائے گی، اور امام ابوحنیفہ کی رائے میں وہ حد کا نہیں بلکہ قید کا سزاوار ہوگا اسی طرح اگر شوہر کے لعان کرچکنے کے بعد عورت لعان سے انکار کرے تو شافعی مالک اور احمد رحمہم اللہ کی رائے یہ ہے کہ اس کو رجم کیا جائے گا، اور امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی رائے یہ ہے کہ اس کو قید کیا جائے گا۔ اس باب میں امام اعظم کا مذہب زیادہ صحیح اور مبنی بر مصلحت ہے لیکن ہندوستان کے ملکی قانون میں اس کی گنجائش نہیں ہے کہ لعان سے انکار کرنے کو جرم مستلزم سزا قرار دیا جائے اس لیے قانون ازدواج کی تدوین جدید میں اس کے لیے مناسب شکل یہ ہوگی کہ اگر مرد لعان سے انکار کرے تو عورت کو اس پر ازالۂ حیثیت عرفی کا دعوٰی کرنے کا حق دیا جائے، اور اگر عورت انکار کرے تو اُسے مہر سے محروم کردیا جائے۔

تطلیقات ثلٰثہ در مجلس واحد | بیک وقت تین طلاق دے کر عورت کو جدا کر دینا نصوص صریحہ کی بنا پر معصیت ہے۔ علماء امت کے درمیان اس مسئلہ میں جو کچھ اختلاف ہے وہ صرف اس امر میں ہے کہ

ایسی تین طلاقیں ایک طلاق رجعی کے حکم میں ہیں یا تین طلاق بائن کے حکم میں لیکن اس کے بدعت اور معصیت ہونے میں کسی کو اختلاف نہیں۔ سب تسلیم کرتے ہیں کہ یہ فعل اس طریقہ کے خلاف ہے جو اللہ اور اس کے رسول نے طلاق کے لیے مقرر فرمایا ہے اور اس سے شریعت کی اہم مصلحتیں فوت ہوجاتی ہیں۔ حدیث میں آیا ہے کہ ایک شخص نے اپنی بیوی کو بیک وقت تین طلاقیں دیں تو حضور غصہ میں آکر کھڑے ہوگئے اور فرمایا أَيُلْعَبُ بِكِتَابِ اللهِ عَزَّ وَجَلَّ وَاَنَا بَيْنَ اَظْهُرِكُمْ کیا اللہ عز وجل کی کتاب سے کھیل کیا جاتا ہے، حالانکہ ابھی میں تمہارے درمیان موجود ہوں؟ بعض دوسری احادیث میں تصریح ہے کہ حضور نے اس فعل کو معصیت فرمایا ہے، اور حضرت عبداللہ ابن عمرؓ کے متعلق تو روایات میں یہاں تک آیا ہے کہ جو شخص ان کے پاس مجلس واحد میں تین طلاق دینے والا آتا تو وہ اس کو درے لگاتے تھے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے اس فعل پر سزا بھی دی جاسکتی ہے۔

ہمارے زمانہ میں یہ طریقہ عام ہوگیا ہے۔ لوگ کسی فوری جذبہ کے تحت اپنی بیویوں کو تین طلاقیں دے دیتے ہیں، پھر نادم ہوتے ہیں اور شرعی حیلے تلاش کرتے پھرتے ہیں۔ کوئی جھوٹی قسمیں کھاکر طلاق سے انکار کرتا ہے، کوئی حلالہ کرانے کی کوشش کرتا ہے، اور کوئی طلاق کو مخفی رکھ کر اپنی بیوی کے ساتھ بدستور سابق تعلقات باقی رکھتا ہے۔ اس طرح ایک گناہ کے نقصان سے بچنے کے لیے متعدد دوسرے گناہوں کا ارتکاب کیا جاتا ہے۔ ان خرابیوں کا سدباب کرنے کے لیے ضروری ہے کہ تطلیقات ثلثہ در مجلس واحد پر ایسی پابندیاں عائد کردی جائیں جن کی وجہ سے لوگ اس فعل کا ارتکاب نہ کرسکیں۔ مثال کے طور پر اس کی ایک صورت یہ ہے کہ مطلقہ عورت کو جسے بیک وقت تین طلاقیں دی گئی ہوں، عدالت میں ہرجانہ کا دعویٰ کرنے کا حق دیا جائے، اور ہرجانہ کی مقدار کم از کم مہر کی نصف مقدار تک مقرر کی جائے۔ اس کے علاوہ اور صورتیں بھی روک تھام کی نکل سکتی ہیں جن کو ہمارے علماء اور ماہرین قانون غور وخوض کے بعد تجویز کرسکتے ہیں۔

خاتمہ کلام | اس مضمون میں اسلامی قانون ازدواج کے مقاصد اور اصول کو تفصیل کے ساتھ بیان کر دیا گیا ہے، اور کتاب و سنت کی تعلیمات کو پیش نظر رکھ کر اُن مسائل کو حل کرنے کی کوشش کی گئی ہے جو آج کل مسلمانان ہند کی ازدواجی زندگی میں مشکلات اور پیچیدگیاں پیدا کر رہے ہیں۔ ہم کو یہ دعویٰ نہیں کہ جو کچھ ہم نے اسلام کے قانون کو سمجھا ہے وہ بالکلیہ صحیح ہے، نہ ہم کو اس پر اصرار ہے کہ حل مشکلات کے لیے جو تجویزیں ہم نے پیش کی ہیں ان کو بعینہٖ قبول کر لیا جائے۔ انسانی رائے میں بہر حال خطا و صواب دونوں کا امکان ہے، اور کسی انسانی رائے کے متعلق یہ دعویٰ نہیں کیا جا سکتا کہ وہ خطا سے پاک اور وحی خداوندی کی طرح واجب الاطاعت ہے۔ ہمارا مقصد اس طویل بحث و تحقیق سے صرف اس قدر تھا کہ قرآن مجید اور سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اسلامی قانون ازدواج کے جو اصول ہم نے سمجھے ہیں ان کو بیان کر دیں، اور پھر ان اصول سے اکابر صحابہ و ائمہ مجتہدین نے جو فروع مستنبط کئے ہیں ان پر نظر ڈال کر ایسے فروع اخذ کر لیں جو ہمارے نزدیک اس زمانے کی ضروریات کے لحاظ سے مفید اور مناسب ہیں۔ اب یہ اہل علم اور اصحاب فکر و رائے کا کام ہے کہ وسعت نظر اور تدبر فی الکتاب والسنہ سے کام لے کر ہماری ان تجاویز پر غور کریں۔ اگر اس میں کچھ خطا پائیں تو اس کی اصلاح کر دیں، اور اگر کوئی چیز صواب نظر آئے تو اس کو محض اس بنا پر رد نہ کر دیں کہ لکھنے والا کسی قسمتی سے چوتھی صدی کے بجائے چودھویں صدی میں پیدا ہوا ہے۔

آخر میں ہم ان مسودات قانون کے متعلق بھی مجملاً اپنی رائے ظاہر کر دینا چاہتے ہیں جو اس سلسلہ میں حیدرآباد اور برطانوی ہند کے بعض حضرات نے مرتب کیے ہیں۔ ہمارے نزدیک یہ سب مسودات اپنی موجودہ صورت میں ضروریات زمانہ کے لحاظ سے غیر مکتفی ہیں۔ اس قسم کے مختصر مسودات سے ان خرابیوں کو دور نہیں کیا جا سکتا جو اینگلو محمڈن لا کے نقائص، اور غیر مسلم عدالتوں کے صد سالہ نفاذ اور موجودہ عدالتی نظام کے طریق کار سے پیدا ہو گئی ہیں۔ اگر چند خاص معاملات میں یہ طے کر دیا گیا کہ فقہ حنفی کے

بجائے فقہ مالکی کے مطابق فیصلہ کیا جائے۔ یا بعض مسائل میں جزئیات کی مختصر تشریح بھی کر دی گئی، تو اس سے وہ حکام عدالت کوئی صحیح فیصلہ کرنے کے قابل نہ ہوسکیں گے جو قوانین شریعت اور مذاہب فقہیہ کے جزئیات پر کوئی وسیع نظر نہیں رکھتے، اور جن کے دماغوں پر وہی اینگلو محمڈن لا کی اسپرٹ مسلط ہے۔ اس بگڑی ہوئی حالت کو درست کرنے کے لئے ضروری ہے کہ خاص کر ازدواجی معاملات کے لئے ایک مفصل ضابطہ مرتب کیا جائے جیسا کہ ہم اس سلسلۂ مضامین کے نمبر ۴ میں عرض کر چکے ہیں یہ کام آسان نہیں ہے۔ وقت اور محنت چاہتا ہے، اور ایک شخص کے بس کا بھی نہیں۔ اس کے لیے اصحاب علم ورائے کی ایک منتخب جماعت کو ایک کافی مدت تک سر جوڑ کر بیٹھنا چاہیے، اور یہ سمجھ کر کام کرنا چاہیے کہ وہ محض متقدمین کی کتابوں سے جزئیات کو لفظ بلفظ نقل کر کے اپنی ذمہ داریوں سے سبکدوش نہیں ہوسکتے، بلکہ قوم کے ارباب حل و عقد ہونے کی حیثیت سے ان کا فرض ہے کہ قوانین شریعت کی ایسی تعبیر کریں جس سے شریعت کے اصلی مقاصد پورے ہوں اور قوم کے دین، اخلاق اور معاملات کی حفاظت کا ٹھیک ٹھیک حق ادا ہو جائے۔

بچوں کیلیے مفید کتابیں

ہمارے نبی کے صحابہ اس کتاب میں صحابہ کرام کی زندگی کے سبق آموز واقعات نہایت سلیس زبان اور دل نشین انداز بیان کے ساتھ جمع کیے گئے ہیں جن سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحبت یافتہ بزرگوں کے اخلاق، دین داری حسن معاشرت اور نیک معاملات کا حال معلوم ہوتا ہے اور ان کے نقش قدم پر چلنے کا شوق پیدا ہوتا ہے قیمت ۶؍ علاوہ محصول ڈاک

مسلمان بی بیاں یہ کتاب "ہمارے نبی کے صحابہ" کی طرح صحابیہ خواتین کے حالات پر مشتمل ہے، جس میں ان مقدس ہستیوں کی دین داری حسن اخلاق اور خانگی زندگی میں ان کے نیک برتاؤ کے واقعات بیان کیے گئے ہیں مسلمان بچیوں کے لیے یہ کتاب شمع ہدایت ہے اور بہت سادہ زبان میں لکھی گئی ہے قیمت ۶؍ علاوہ محصول ڈاک۔

دفتر ترجمان القرآن سے طلب کیجئے۔

تنزیل و تاویل

تفسیر سورۂ کافرون

از جناب مولانا عبدالقدیر صاحب صدیقی

قُلْ یٰۤاَیُّهَا الْكٰفِرُوْنَ - الف لام عہد خارجی کا ہے۔ یعنی وہ خاص شخص یا گروہ جس کا ذکر پہلے آچکا ہے۔ یا جو مخاطب ہے یا جس کے متعلق گفتگو ہو رہی ہے جیسے جاءالرجل۔ وہ خاص شخص آیا۔ یہاں الکافرون سے مراد قریش کے چند مخصوص کفار ہیں۔

الکافرون۔ کفر یکفر مثل نصر کفراً۔ انکار کرنا اس کے اصلی معنی ڈھانکنا ہیں۔ رات کو کافر کہتے ہیں۔ کیونکہ وہ اپنی تاریکی میں سب کو ڈھانک لیتی ہے۔

لی فیک اجر مجاھد　　ان صح ان اللیل کافر

اے شب فرقت مجھے تجھ میں ایک مجاہد کا ثواب ہے۔ کیونکہ تو کافر ہے۔

کسان کو بھی کافر کہتے ہیں۔ کیونکہ وہ تخم کو زمین میں ڈھانک دیتا ہے۔ کفارہ۔ گناہ کا بدلہ جو گناہ کو ڈھانک دے۔ اس کے بعد یہ لفظ انکار اور حق پوشی کے معنوں میں مستعمل ہونے لگا ہے

بعض جاہل کفار نے حضرت سے کہا۔ یا محمدؐ! تم ایک سال ہمارے بتوں کی پوجا کرو۔ اور ہم تمہارے خدا کی ایک سال عبادت کریں گے۔ ان کے جواب میں یہ سورت اتری۔

لَاۤ اَعْبُدُ مَا تَعْبُدُوْنَ - مضارع پر لا بھی آتا ہے اور ما بھی۔ لا مستقبل کے لیے آتا ہے۔ اور ما حال کے لیے۔ ما افعل میں نہیں کرتا ہوں۔ لا افعل میں نہیں کروں گا۔

عبادۃ۔ عبد مثل نصر انتہائی تذلل و فروتنی۔ اسی سے مشتق ہے طریق معبد خوب روندا ہوا راستہ اور ثوب ذو عبدۃ صاف چکنا کپڑا۔ اسی لیے انتہائی عاجزی کی جو صورت اسلام میں مقرر کی گئی ہے، یعنی سجدہ غیر خدا کے لیے جائز نہیں۔

کیا تعظیم کرنا، گردن جھکانا بھی ناجائز ہے؟ نہیں۔ بزرگوں کی تعظیم تو ضروری ہے۔ وَاخْفِضْ لَهُمَا جَنَاحَ الذُّلِّ۔ ماں باپ کے لیے ذلت و فروتنی کے بازو جھکا دے۔

کیا عبد فلاں کہنا یا ایسا نام رکھنا جائز ہے؟ عبد کا لفظ تین جگہ مستعمل ہوتا ہے۔

(۱) مخلوق جیسے عبد اللہ۔ عبد الرحمن۔ عبد القادر وغیرہ اس معنی کے لحاظ سے سوائے خدائے تعالیٰ کے کوئی شخص کسی کا نہ مخلوق ہے نہ عبد۔

(۲) زرخرید غلام۔ فقہ کی تمام کتابیں عبد کے اس معنی سے بھری پڑی ہیں۔

(۳) مطیع فرمانبردار۔ خادم۔ حضرت عمرؓ خلیفہ ہوئے تو ان کے پہلے خطبہ میں ہے۔ کنتُ عبدہٗ وخادمہ میں رسول خدا کا بندہ تھا خادم تھا۔ حضرت علی سے کسی یہودی نے چند سوالات کیے۔ آپ نے اس کے جواب باصواب دیے۔ تو اس نے پوچھا اَنْتَ نبیٌ من الانبیاء کیا آپ پیغمبروں میں کے کوئی پیغمبر ہیں؟ آپ نے فرمایا ویحک! انا عبدٌ من عبید محمدؐ تجھ پر افسوس ہے میں محمد کے بندوں میں سے ایک بندہ ہوں۔ یہاں عبد یا بندہ کا لفظ بمعنی مطیع و خادم کے ہے۔

قُلْ يَا أَيُّهَا الْكَافِرُونَ لَا أَعْبُدُ مَا تَعْبُدُونَ۔ اے محمدؐ تم کہو اے اللہ اور دین حق کے منکرو! میں نہ پوجوں گا ان بتوں، ان دیوتاؤں، ان گذشتہ لوگوں کو جن کو تم پوجتے ہو۔

وَلَا أَنْتُمْ عَابِدُونَ مَا أَعْبُدُ۔ اور نہ تم اس خدائے واحد کی عبادت کرنے والے ہو جس کی میں عبادت کرتا ہوں۔

وَلَا أَنَا عَابِدٌ مَا عَبَدْتُّمْ۔ اور نہ میں پوجنے والا ہوں۔ اس طرح جس طرح کہ تمہاری پوجا ہوتی ہے

وَلَآ اَنْتُمْ عَابِدُوْنَ مَآ اَعْبُدُ ؕ اور نہ تم عبادت کرنے والے ہو جس طرح میں عبادت کرتا ہوں ۔ یعنی میرا اور تمہارا معبود بھی الگ ہے ۔ اور طریقۂ عبادت بھی جدا ہے ۔ پہلے کے دو ما بمعنی الذی و موصول ہیں ۔ یعنی وہ جس کی عبادت کی جاتی ہے ۔ اور دوسرے دو ما بمعنی مصدر ہیں ۔ یعنے پوجا پوجنا ۔ ہمارے مختار معنی پر ان جملوں میں پہلے جملوں کی تاکید نہیں ہے ۔ بلکہ تاسیس ہے یعنے نئے اور جدا معنے ہیں ۔

دین ۔ بدلہ اور جزا مذہب اور دھرم ۔ کما تدین تدان ۔ جیسا کروگے ویسا بھروگے دِنَّاھُمْ کَمَا دَانُوا ہم نے ان کو ویسا ہی بدلہ دیا جیسا انھوں نے کام کیا تھا ۔

دِیْنِ ۔ کسرہ نون سے اس کی اصل دینی ہے ۔ یا تخفیفاً حذف کیگئی اور کسرہ رکھا گیا تاکہ حذفِ یا پر دلالت کرے ۔

لَکُمْ دِیْنُکُمْ وَلِیَ دِیْنِ ۔ تمکو تمہارے کاموں کا بدلہ ملے گا ۔ اور مجھکو میرے کاموں کا ۔ یا تم اپنا باطل دھرم نہیں چھوڑتے تو میں اپنا حق مذہب کیوں کر چھوڑ سکتا ہوں ۔ اس آیت کے معنی بعض لوگ ایسے کرتے ہیں جس سے نکلتا ہے ، کہ تم اپنے دھرم پر رہو ۔ اور ہم اپنے مذہب پر رہیں گے ۔ اور پھر یہ بھی کہتے ہیں کہ یہ آیت اجازت جنگ سے پہلے کی ہے ۔ لہذا منسوخ ۔ بھلا آپ نے پہلے ایسے معنی ہی کیوں لیے جن پر منسوخیت کا دعوی کرنا پڑا ۔

رسائل و مسائل

سود، پردہ، طلاق اور مہر

(۳)

اشاعت گذشتہ میں قلت گنجائش کی وجہ سے یہ مضمون ایسی جگہ ختم کر دینا پڑا جہاں سلسلۂ کلام پورا نہ ہوا تھا، لہذا قارئین کرام کی آسانی کے لیے اشاعت گذشتہ کے آخری فقرات یہاں پھر نقل کیے جاتے ہیں۔

۳۔ **خرچ کرنے کا حکم** جمع کرنے کے بجائے اسلام خرچ کرنے کی تعلیم دیتا ہے، مگر خرچ کرنے سے اس کا مقصد یہ نہیں ہے کہ آپ اپنے عیش و آرام اور گلچھرے اڑانے میں دولت لٹائیں، بلکہ وہ خرچ کرنے کا حکم فی سبیل اللہ کی قید کے ساتھ دیتا ہے یعنی آپ کے پاس اپنی ضروریات سے جو کچھ بچ رہے اس کو نیک اور مفید کاموں میں خرچ کر دیں کہ یہی سبیل اللہ ہے۔

وَيَسْـَٔلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ قُلِ الْعَفْوَ۔ (۲: ۲۷)

اور وہ تم سے پوچھتے ہیں کہ کیا خرچ کریں۔ کہو کہ جو ضرورت سے بچ رہے۔

وَبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا وَّبِذِي الْقُرْبٰى
وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَالْجَارِ ذِي
الْقُرْبٰى وَالْجَارِ الْجُنُبِ وَالصَّاحِبِ
بِالْجَنْۢبِ وَابْنِ السَّبِيْلِ وَمَا مَلَكَتْ

اور احسان کرو اپنے ماں باپ کے ساتھ اور اپنے
رشتہ داروں اور یتیموں و نادار مسکینوں اور قرابتدار
پڑوسیوں اور اجنبی ہمسایوں اور اپنے ملنے جلنے
والے دوستوں اور مسافروں اور لونڈی غلاموں

اَیۡمَانُکُمۡ (۶:۴) کے ساتھ۔

وَفِیۡۤ اَمۡوَالِهِمۡ حَقٌّ لِّلسَّآئِلِ وَالۡمَحۡرُوۡمِ (۵۱:۱۹) اور ان کے مالوں میں سائل اور نادار کا حق ہے۔

اس باب میں اسلام کا نقطۂ نظر سرمایہ داری کے نقطۂ نظر سے بالکل مختلف ہے۔ سرمایہ دار سمجھتا ہے کہ خرچ کرنے سے مفلس ہو جاؤں گا۔ اور جمع کرنے سے مالدار بنوں گا۔ اسلام کہتا ہے خرچ کرنے سے برکت ہوگی، تیری دولت گھٹے گی نہیں بلکہ اور بڑھے گی۔

اَلشَّیۡطٰنُ یَعِدُکُمُ الۡفَقۡرَ وَیَاۡمُرُکُمۡ بِالۡفَحۡشَآءِ وَاللّٰهُ یَعِدُکُمۡ مَّغۡفِرَةً مِّنۡهُ وَفَضۡلًا۔ (۲:۳۶) شیطان تم کو ناداری کا خوف دلاتا ہے اور بخل جیسی شرمناک بات کا حکم دیتا ہے، مگر اللہ تم سے بخشش اور مزید عطا کا وعدہ کرتا ہے۔

سرمایہ دار سمجھتا ہے کہ جو کچھ خرچ کر دیا وہ کھویا گیا۔ اسلام کہتا ہے کہ نہیں وہ کھویا نہیں گیا بلکہ اس کا بہتر فائدہ تمھاری طرف پھر پلٹ کر آئے گا۔

وَمَا تُنۡفِقُوۡا مِنۡ خَیۡرٍ یُّوَفَّ اِلَیۡکُمۡ وَاَنۡتُمۡ لَا تُظۡلَمُوۡنَ۔ (۲:۳۷) اور تم نیک کاموں میں جو کچھ خرچ کروگے وہ تم کو پورا پورا واپس ملے گا اور تم پر ہرگز ظلم نہ ہوگا۔

وَاَنۡفَقُوۡا مِمَّا رَزَقۡنٰهُمۡ سِرًّا وَّعَلَانِیَةً یَّرۡجُوۡنَ تِجَارَةً لَّنۡ تَبُوۡرَ لِیُوَفِّیَهُمۡ اُجُوۡرَهُمۡ وَیَزِیۡدَهُمۡ مِّنۡ فَضۡلِهٖ۔ (۳۵:۴) اور جن لوگوں نے ہمارے بخشے ہوئے رزق میں سے کھلے اور چھپے طریقہ سے خرچ کیا وہ ایک ایسی تجارت کی امید رکھتے ہیں جس میں گھاٹا ہرگز نہیں ہے۔ اللہ ان کے بدلے ان کو پورے پورے اجر دیگا بلکہ اپنے فضل سے کچھ زیادہ ہی عنایت کرے گا۔

سرمایہ دار سمجھتا ہے کہ دولت کو جمع کر کے اس کو سود پر چلانے سے دولت بڑھتی ہے اسلام کہتا ہے کہ نہیں، سود سے تو دولت گھٹ جاتی ہے۔ دولت کو بڑھانے کا ذریعہ نیک کاموں میں

مال کو خرچ کرنا ہے۔

یَمْحَقُ اللّٰہُ الرِّبٰوا وَیُرْبِی الصَّدَقٰتِ۔ (۲ : ۳۸)

اللہ سود کا مٹھ مار دیتا ہے اور صدقات کو نشوونما دیتا ہے۔

وَمَآ اٰتَیْتُمْ مِّنْ رِّبًا لِّیَرْبُوَا فِیْٓ اَمْوَالِ النَّاسِ فَلَا یَرْبُوْا عِنْدَ اللّٰہِ وَمَآ اٰتَیْتُمْ مِّنْ زَکٰوۃٍ تُرِیْدُوْنَ وَجْہَ اللّٰہِ فَاُولٰٓئِکَ ہُمُ الْمُضْعِفُوْنَ۔ (۳۰ : ۴)

اور یہ جو تم سود دیتے ہو تاکہ لوگوں کے اموال میں اضافہ ہو تو اللہ کے نزدیک وہ ہرگز نہیں بڑھتا۔ بڑھوتری تو ان اموال کو نصیب ہوتی ہے جو تم اللہ کے لیے زکوٰۃ میں دیتے ہو۔

یہ ایک نیا نظریہ ہے جو سرمایہ داری کے نظریہ کی بالکل ضد ہے۔ خرچ کرنے سے دولت کا بڑھنا، اور خرچ کیے ہوئے مال کا ضائع نہ ہونا بلکہ اس کا پورا پورا بدل کچھ زائد فائدے کے ساتھ واپس آنا، اور سود سے دولت میں اضافہ ہونے کے بجائے الٹا گھاٹا آنا، اور زکوٰۃ و صدقات سے دولت میں کمی واقع ہونے کے بجائے اضافہ ہونا ایسے نظریات ہیں جو بظاہر عجیب معلوم ہوتے ہیں۔ اور سننے والا سمجھتا ہے کہ ان سب باتوں کا تعلق محض ثواب آخرت سے ہے۔ اس میں شک نہیں کہ ان باتوں کا تعلق ثواب آخرت سے بھی ہے۔ اور اسلام کی نگاہ میں اصلی اہمیت اسی کی ہے لیکن اگر غور سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ اس دنیا میں بھی معاشی حیثیت سے یہ نظریات ایک نہایت مضبوط بنیاد پر قائم ہیں۔ دولت کو جمع کرنے اور اس کو سود پر چلانے کا آخری نتیجہ یہ ہے کہ دولت سمٹ کر چند افراد کے پاس اکٹھی ہو جائے، جمہور کی قوت خرید روز بروز گھٹتی چلی جائے، صنعت اور تجارت اور زراعت میں کساد بازاری رونما ہو، قوم کی معاشی زندگی تباہی کے سرے پر جا پہنچے، اور آخر کار خود ان سرمایہ دار افراد کے لیے بھی اپنی جمع شدہ دولت کو افزائش دولت کے کاموں میں لگانے کا کوئی موقع باقی نہ رہے۔ بخلاف اس کے خرچ کرنے اور زکوٰۃ و صدقات دینے کا

مآل یہ ہے کہ قوم کے تمام افراد تک دولت پھیل جائے، ہر ہر شخص کو کافی قوتِ خرید حاصل ہو، صنعتیں پرورش پائیں، کھیتیاں سرسبز ہوں، تجارت کو خوب فروغ ہو، اور چاہے کوئی لکھ پتی اور کروڑ پتی نہ ہو، مگر سب خوش حال و فارغ البال ہوں۔ اس مآل اندیشانہ معاشی نظریہ کی صداقت اگر دیکھنی ہو تو امریکہ کے موجودہ معاشی حالات کو دیکھیے جہاں سود ہی کی وجہ سے تقسیم ثروت کا توازن بگڑ گیا ہے، اور صنعت و تجارت کی کساد بازاری نے قوم کی معاشی زندگی کو تباہی کے سرے پر پہنچا دیا ہے۔ اس کے مقابلہ میں ابتدائے عہد اسلامی کی حالت کو دیکھیے کہ جب اس معاشی نظریہ کو پوری شان کے ساتھ عملی جامہ پہنایا گیا تو چند سال کے اندر قوم کی خوش حالی اس حد کو پہنچ گئی کہ لوگ زکوٰۃ کے مستحقین کو ڈھونڈتے پھرتے تھے اور مشکل ہی کوئی ایسا شخص ملتا تھا جو خود صاحب نصاب نہ ہو۔ ان دونوں حالتوں کا موازنہ کرنے سے معلوم ہو جائے گا کہ اللہ کس طرح سود کا مٹھ مارتا ہے اور صدقات کو نشوونما دیتا ہے۔

پھر اسلام جو ذہنیت پیدا کرتا ہے وہ بھی سرمایہ دارانہ ذہنیت سے بالکل مختلف ہے۔ سرمایہ دار کے ذہن میں کسی طرح یہ تصور سما ہی نہیں سکتا کہ ایک شخص اپنا روپیہ دوسرے کو سود کے بغیر کیسے دے سکتا ہے۔ وہ قرض پر نہ صرف سود لیتا ہے بلکہ اپنے راس المال اور سود کی بازیافت کے لیے قرض دار کے کپڑے اور گھر کے برتن تک قرق کرا لیتا ہے۔ مگر اسلام کی تعلیم یہ ہے کہ حاجت مند کو صرف قرض ہی نہ دو بلکہ اگر وہ تنگ دست ہو تو اس پر تقاضے میں سختی بھی نہ کرو، حتیٰ کہ اگر اس میں دینے کی استطاعت نہ ہو تو معاف کر دو۔

وَإِن كَانَ ذُو عُسْرَةٍ فَنَظِرَةٌ إِلَىٰ مَيْسَرَةٍ ۚ وَأَن تَصَدَّقُوا خَيْرٌ لَّكُمْ ۖ إِن كُنتُمْ تَعْلَمُونَ ۲۸۰

اگر قرض دار تنگ دست ہو تو اس کی حالت درست ہونے تک اسے مہلت دیدو، اور اگر معاف کر دو تو یہ تمہارے لیے زیادہ بہتر ہے۔ اس کا فائدہ تم سمجھ سکتے ہو اگر کچھ علم رکھتے ہو۔

سرمایہ داری میں امداد باہمی کے معنی یہ ہیں کہ آپ انجمن امداد باہمی کو پہلے روپیہ دے کر اس کے رکن بنیئے، پھر اگر کوئی ضرورت آپ کو پیش آئے گی تو انجمن آپ کو عام بازاری شرح سود سے کچھ کم پر قرض دیدے گی، اگر آپ کے پاس روپیہ نہیں ہے تو "امداد باہمی" سے آپ کچھ بھی امداد حاصل نہیں کر سکتے۔ برعکس اس کے اسلام کے ذہن میں امداد باہمی کا تصور یہ ہے کہ جو لوگ ذی استطاعت ہوں وہ ضرورت کے وقت اپنے کم استطاعت بھائیوں کو نہ صرف قرض دیں بلکہ قرض ادا کرنے میں بھی حسبۃً للہ ان کی مدد کریں، چنانچہ زکوٰۃ کے مصارف میں سے ایک مصرف والغارمین بھی ہے یعنی قرضداروں کے قرض ادا کرنا۔

سرمایہ دار اگر نیک کاموں میں خرچ کرتا بھی ہے تو محض نمائش کے لیے، کیونکہ اس کے نقطۂ نظر کے نزدیک اس خرچ کا کم سے کم یہ معاوضہ تو اس کو حاصل ہونا چاہیے کہ اس کا نام ہو جائے، اس کو مقبولیت عام حاصل ہو، اس کی دھاک اور ساکھ بیٹھ جائے۔ مگر اسلام کہتا ہے کہ خرچ کرنے میں نمائش ہرگز نہ ہونی چاہیے۔ خفیہ یا علانیہ جو کچھ بھی خرچ کرو۔ اس میں یہ مقصد پیش نظر ہی نہ رکھو کہ فوراً اس کا بدل تم کو کسی نہ کسی شکل میں مل جائے، بلکہ مآل کار پر نگاہ رکھو۔ اس دنیا سے لیکر آخرت تک جتنی دور تمہاری نظر جائے گی تم کو یہ خرچ پھلتا پھولتا اور منافع پر منافع پیدا کرتا ہی دکھائی دے گا۔ "جو شخص اپنے مال کو نمائش کے لیے خرچ کرتا ہے اس کی مثال ایسی ہے جیسے ایک چٹان پر مٹی پڑی تھی۔ اس نے اس مٹی پر بیج بویا، مگر پانی کا ایک ریلا آیا اور مٹی کو بہالے گیا۔ اور جو شخص اپنی نیت کو درست رکھکر اللہ کی خوشنودی کے لیے خرچ کرتا ہے اس کی مثال ایسی ہے جیسے اس نے ایک عمدہ زمین میں باغ لگایا اگر بارش ہوگئی تو دوگنا پھل لایا اور اگر بارش نہ بھی ہوئی تو محض ہلکی سی پھوار اس کے لیے کافی ہے۔" (سورۂ بقرہ رکوع ۳۶)۔

۲- اِن تُبدُوا الصَّدَقَاتِ فَنِعِمَّا ھِیَ وَ   اگر صدقات علانیہ دو تو یہ بھی اچھا ہے لیکن اگر

اِنۡ تُخۡفُوۡهَا وَتُؤۡتُوۡهَا الۡفُقَرَآءَ فَهُوَ خَيۡرٌ لَّكُمۡ (۲: ۲۷)۔	چھپا کر دو اور غریب لوگوں تک پہنچاؤ تو یہ زیادہ بہتر ہے۔

سرمایہ دار اگر نیک کام میں صرف بھی کرتا ہے تو با دل ناخواستہ بدتر سے بدتر مال دیتا ہے اور پھر جس کو دیتا ہے اس کی آدھی جان اپنی زبان کے تیروں سے نکال لیتا ہے۔ اسلام اس کے بالکل برعکس یہ سکھاتا ہے کہ اچھا مال خرچ کرو، اور خرچ کرکے احسان نہ جتاؤ، بلکہ اس کی خواہش بھی نہ رکھو کہ کوئی تمہارے سامنے احسان مندی کا اظہار کرے۔

اَنۡفِقُوۡا مِنۡ طَيِّبٰتِ مَا كَسَبۡتُمۡ وَمِمَّاۤ اَخۡرَجۡنَا لَـكُمۡ مِّنَ الۡاَرۡضِ وَلَا تَيَمَّمُوا الۡخَبِيۡثَ مِنۡهُ تُنۡفِقُوۡنَ ۔ (۲: ۳۷)۔	تم نے جو کچھ کمایا ہے اور جو کچھ ہم نے تمہارے لیے زمین سے نکالا ہے اس میں سے عمدہ اموال کو راہِ خدا میں صرف کرو نہ یہ کہ بدتر مال چھانٹ کر اس میں سے دینے لگو۔
لَا تُبۡطِلُوۡا صَدَقٰتِكُمۡ بِالۡمَنِّ وَالۡاَذٰى۔ (۲: ۳۶)	اپنے صدقات کو احسان جتا کر اور اذیت پہونچا کر ملیامیٹ نہ کردو۔
وَيُطۡعِمُوۡنَ الطَّعَامَ عَلٰى حُبِّهٖ مِسۡكِيۡنًا وَّيَتِيۡمًا وَّاَسِيۡرًا۔ اِنَّمَا نُطۡعِمُكُمۡ لِوَجۡهِ اللّٰهِ لَا نُرِيۡدُ مِنۡكُمۡ جَزَآءً وَّلَا شُكُوۡرًا (۷۶: ۱)	اور وہ اللہ کی محبت میں مسکین اور یتیم اور قیدی کو کھانا کھلاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہم تو اللہ کے لیے تم کو کھلاتے ہیں ہم تم سے کسی جزا اور شکریہ کے خواہش مند نہیں ہیں۔

چھوڑیے اس سوال کو کہ اخلاقی نقطۂ نظر سے ان دونوں ذہنیتوں میں کتنا عظیم تفاوت ہے ہم کہتے ہیں کہ خالص معاشی نقطۂ نظر ہی سے دیکھ لیجئے کہ فائدے اور نقصان کے ان دونوں نظریوں میں سے کونسا نظریہ زیادہ محکم اور دوررس نتائج کے اعتبار سے زیادہ صحیح ہے۔ پھر جب کہ

منفعت و مضرت کے باب میں اسلام کا نظریہ وہ ہے جو آپ دیکھ چکے ہیں تو کیونکر ممکن ہے کہ اسلام کسی شکل میں بھی سودی کاروبار کو جائز رکھے؟

۴۔ زکوٰۃ | اسلام کا اصل مقصد، جیسا کہ پہلے بیان ہوا، یہ ہے کہ دولت کسی جگہ جمع نہ ہونے پائے جماعت میں جن لوگوں کو اپنی بہتر قابلیت یا خوش قسمتی کی بنا پر ان کی ضروریات سے زیادہ دولت میسر آجائے وہ اس کو سمیٹ کر نہ رکھیں، بلکہ خرچ کریں، اور ایسے مصارف میں خرچ کریں جن سے دولت کی گردش میں سوسائٹی کے کم نصیب افراد کو بھی کافی حصہ مل جائے۔ اس غرض کے لیئے اسلام ایک طرف تو اپنی بلند اخلاقی تعلیم اور ترغیب و ترہیب کے نہایت موثر طریقوں سے فیاضی اور حقیقی امداد باہمی کی اسپرٹ پیدا کرتا ہے تاکہ لوگ خود اپنے میلان طبع ہی سے دولت جمع کرنے کو برا سمجھیں اور اسے خرچ کر دینے کی طرف راغب ہوں۔ دوسری طرف وہ ایسا قانون بناتا ہے کہ جو لوگ فیاضی کی اس تعلیم کے باوجود اپنی افتاد طبع کی وجہ سے روپیہ جوڑنے اور مال سمیٹنے کے خوگر ہوں، ان کے مال میں سے بھی کم از کم ایک حصہ سوسائٹی کی فلاح و بہبود کے لیے ضرور نکلوا لیا جائے۔ اسی چیز کا نام زکوٰۃ ہے، اور اسلام کے معاشی نظام میں اس کو اتنی اہمیت دی گئی ہے کہ اس کو ارکان اسلام میں شامل کیا گیا ہے، نماز کے بعد سب سے زیادہ اسی کی تاکید کی گئی ہے، اور صاف صاف کہہ دیا گیا ہے کہ جو شخص دولت جمع کرتا ہے، اس کی دولت اس کے لیے حلال ہی نہیں ہو سکتی تاوقتیکہ وہ زکوٰۃ نہ ادا کرے۔

خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً تُطَهِّرُهُمْ وَتُزَكِّيْهِمْ بِهَا۔ (۹: ۱۰۳)۔ ان کے اموال میں سے زکوٰۃ لے اور اس کے ذریعہ سے ان کو پاک اور طاہر کر دے۔

لفظ زکوٰۃ خود اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ مال دار آدمی کے پاس جو دولت جمع ہوتی ہے وہ اسلام کی نگاہ میں ایک نجاست ہے، ایک ناپاکی ہے اور وہ پاک نہیں ہو سکتی جب تک کہ

اس کا مالک اس میں سے ہر سال کم از کم ڈھائی فی صدی راہ خدا میں نہ خرچ کر دے۔ "راہ خدا" کیا ہے، خدا کی ذات تو بے نیاز ہے، اس کو نہ تمہارا مال پہنچتا ہے نہ وہ اس کا حاجتمند ہے اس کی راہ بس یہی ہے کہ تم خود اپنی قوم کے تنگ حال لوگوں کو خوش حال بنانے کی کوشش کرو اور ایسے مفید کاموں کو ترقی دو جن کا فائدہ ساری قوم کو حاصل ہوتا ہے:۔

إِنَّمَا الصَّدَقَاتُ لِلْفُقَرَاءِ وَالْمَسَاكِينِ وَالْعَامِلِينَ عَلَيْهَا وَالْمُؤَلَّفَةِ قُلُوبُهُمْ وَفِي الرِّقَابِ وَالْغَارِمِينَ وَفِي سَبِيلِ اللَّهِ وَابْنِ السَّبِيلِ (۹: ۸)

صدقات تو دراصل فقراء اور مساکین کے لیے ہیں اور ان کارکنوں کے لیے جو صدقات کی تحصیل پر مقرر ہوں اور ان لوگوں کے لیے جو اسلام میں نئے نئے داخل ہوئے ہوں اور لوگوں کی گردنیں بند اسیری سے چھڑانے کے لیے اور قرض داروں کے قرض ادا کرنے کے لیے اور جہاد کی ضروریات کیلئے اور مسافروں کیلئے

یہ مسلمانوں کی کوآپریٹو سوسائٹی ہے، یہ ان کی انشورنس کمپنی ہے، یہ ان کا پراویڈنٹ فنڈ ہے، یہ ان کے بیکاروں کا سرمایۂ اعانت (ڈول) ہے، یہ ان کے معذوروں، اپاہجوں، بیماروں، یتیموں، بیواؤں کا ذریعۂ پرورش ہے، اور ان سب سے بڑھ کر یہ وہ چیز ہے جو مسلمان کو فکر فردا سے بالکل بے نیاز کر دیتی ہے۔ اس کا سیدھا سادھا اصول یہ ہے کہ آج تم مالدار ہو تو دوسروں کی مدد کرو۔ کل تم نادار ہو گئے تو دوسرے تمہاری مدد کریں گے۔ تمہیں یہ فکر کرنے کی ضرورت ہی نہیں کہ مفلس ہو گئے تو کیا بنے گی؟ مر گئے تو بیوی بچوں کا کیا حشر ہو گا؟ کوئی آفت ناگہانی آپڑی، بیمار ہو گئے، گھر میں آگ لگ گئی، سیلاب آگیا، دیوالہ نکل گیا تو ان مصیبتوں سے مخلصی کی کیا سبیل ہوگی؟ سفر میں پیسہ پاس نہ رہا تو کیونکر گذر بسر ہو گی؟ ان سب فکروں سے صرف زکوٰۃ تم کو ہمیشہ کے لیے بے فکر کر دیتی ہے۔ تمہارا کام بس اتنا ہے کہ اپنی پس انداز کی ہوئی دولت میں سے ڈھائی فی صدی دے کر خدا کی انشورنس کمپنی میں اپنا بیمہ کرا لو۔ اس وقت تم کو

اس دولت کی ضرورت نہیں ہے، یہ ان کے کام آئے گی جو اس کے ضرورت مند ہیں لیکن جب تم ضرورت مند ہو گے یا تمہاری اولاد ضرورت مند ہو گی تو نہ صرف تمہارا اپنا دیا ہوا مال بلکہ اس سے بھی بہت زیادہ تم کو واپس مل جائے گا۔

یہاں پھر سرمایہ داری اور اسلام کے اصول و مناہج میں کلی تضاد نظر آتا ہے۔ سرمایہ داری کا اقتضاء یہ ہے کہ روپیہ جمع کیا جائے، اور اس کو بڑھانے کے لیے سود لیا جائے تاکہ ان نالیوں کے ذریعہ سے آس پاس کے لوگوں کا روپیہ بھی سمٹ کر اس تالاب میں جمع ہو جائے۔ اسلام اس کے بالکل خلاف یہ حکم دیتا ہے کہ روپیہ اول تو جمع ہی نہ ہو، اور اگر جمع ہو بھی تو اس تالاب میں سے زکوٰۃ کی نہریں نکال دی جائیں تاکہ جو کھیت سوکھے ہیں ان کو پانی پہنچے اور گرد و پیش کی ساری زمین شاداب ہو جائے۔ سرمایہ داری کے نظام میں دولت کا مبادلہ مقید ہے اور اسلام میں آزاد۔ سرمایہ داری کے تالاب سے پانی لینے کے لیے ناگزیر ہے کہ خاص آپ کا پانی پہلے سے وہاں موجود ہو، ورنہ آپ ایک قطرۂ آب بھی وہاں سے نہیں لے سکتے۔ اس کے مقابلہ میں اسلام کے خزانہ آب کا قاعدہ یہ ہے کہ جس کے پاس ضرورت سے زیادہ پانی ہو وہ اس میں لا کر ڈال دے اور جس کو پانی کی ضرورت ہو وہ اس میں سے لے لے۔ ظاہر ہے کہ یہ دونوں طریقے اپنی اصل اور طبیعت کے لحاظ سے ایک دوسرے کی پوری پوری ضد ہیں اور ایک ہی نظم معیشت میں ان دونوں کو جمع کرنا درحقیقت اضداد کو جمع کرنا ہے جس کا تصور بھی کوئی عاقل نہیں کر سکتا۔

۵۔ قانون وراثت اپنی ضروریات پر خرچ کرنے اور راہ خدا میں دینے اور زکوٰۃ ادا کرنے کے بعد بھی جو دولت کسی ایک جگہ سمٹ کر رہ گئی ہو، اس کو پھیلانے کے لیے پھر ایک تدبیر اسلام نے اختیار کی ہے، اور وہ اس کا قانون وراثت ہے۔ اس قانون کا منشا یہ ہے کہ جو شخص مال چھوڑ کر

مرجائے خواہ وہ زیادہ ہو یا کم، اس کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے نزدیک و دور کے تمام رشتہ داروں میں درجہ بدرجہ پھیلا دیا جائے۔ تقسیم وراثت کا یہ قانون جیسا اسلام میں پایا جاتا ہے کسی اور معاشی نظام میں نہیں پایا جاتا۔ دوسرے معاشی نظاموں کا میلان اس طرف ہے کہ جو دولت ایک شخص نے سمیٹ کر جمع کی ہے وہ اس کے بعد بھی ایک یا چند خاص اشخاص کے پاس سمٹی رہے مگر اسلام دولت کے سمٹنے کو پسند ہی نہیں کرتا۔ وہ اس کو پھیلانا چاہتا ہے تاکہ دولت کی گردش میں آسانی ہو۔

۶۔ غنائم جنگ اور اموال مفتوحہ کی تقسیم اس معاملہ میں بھی اسلام نے وہی مقصد پیش نظر رکھا ہے جنگ میں جو مال غنیمت فوجوں کے ہاتھ آئے اس کے متعلق یہ قانون بنایا گیا کہ اس کے پانچ حصے کیے جائیں، چار حصے فوج میں تقسیم کر دیے جائیں، اور ایک حصہ اس غرض کے لیے رکھ لیا جائے کہ عام قومی مصالح میں صرف ہو۔

وَاعْلَمُوْٓا اَنَّمَا غَنِمْتُمْ مِّنْ شَیْءٍ فَاَنَّ	جان لو کہ جو کچھ تم کو غنیمت میں ہاتھ آئے اس کا
لِلّٰهِ خُمُسَهٗ وَلِلرَّسُوْلِ وَلِذِی الْقُرْبٰی	پانچواں حصہ اللہ اور اس کے رسول اور رسول کے رشتہ داروں
وَالْیَتٰمٰی وَالْمَسٰكِیْنِ وَابْنِ السَّبِیْلِ ۙ	اور یتیموں اور مساکین اور مسافروں کے لیے ہے۔

اللہ اور رسول کے حصہ سے مراد ان اجتماعی اغراض و مصالح کا حصہ ہے جن کی نگرانی اللہ اور رسول کے تحت حکم اسلامی حکومت کے سپرد کی گئی ہے۔ رسول کے رشتہ داروں کا حصہ اس لیے رکھا گیا ہے کہ زکوٰۃ میں ان کا حصہ نہیں ہے۔ اس کے بعد خمس میں تین طبقوں کا حصہ خصوصیت کے ساتھ رکھا گیا ہے۔ ایک قوم کے یتیم بچے تاکہ ان کی تعلیم و تربیت کا انتظام ہو اور ان کو زندگی کی جد و جہد میں حصہ لینے کے قابل بنایا جائے۔ دوسرے مساکین جن میں بیوہ عورتیں، اپاہج، معذور، بیمار، بے روزگار سب شامل ہیں۔ تیسرے ابن السبیل یعنی مسافر۔ اسلام نے اپنی اخلاقی

تعلیم سے لوگوں میں مسافر نوازی کا میلان خاص طور پر پیدا کیا گیا اور اس کے ساتھ زکوٰۃ وصدقات اور غنائم جنگ میں بھی مسافروں کا حق رکھا ہے ۔ یہ وہ چیز ہے جس نے اسلامی ممالک میں تجارت، سیاحت، تعلیم اور مطالعہ و مشاہدہٴ آثار و احوال کے لیے لوگوں کی نقل و حرکت میں بڑی آسانیاں پیدا کر دیں۔

جنگ کے نتیجہ میں جو اراضی اور اموال اسلامی حکومت کے ہاتھ آئیں ان کے لیے یہ قانون بنایا گیا کہ ان کو بالکلیہ حکومت کے قبضہ میں رکھا جائے۔

مَآ اَفَآءَ اللّٰهُ عَلٰى رَسُوْلِهٖ مِنْ اَهْلِ الْقُرٰى فَلِلّٰهِ وَلِلرَّسُوْلِ وَلِذِى الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَابْنِ السَّبِيْلِ كَىْ لَا يَكُوْنَ دُوْلَةًۢ بَيْنَ الْاَغْنِيَآءِ مِنْكُمْ ...... لِلْفُقَرَآءِ الْمُهٰجِرِيْنَ الَّذِيْنَ اُخْرِجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ وَاَمْوَالِهِمْ ...... وَالَّذِيْنَ تَبَوَّؤُ الدَّارَ وَالْاِيْمَانَ مِنْ قَبْلِهِمْ ..... وَالَّذِيْنَ جَآءُوْ مِنْۢ بَعْدِهِمْ (۵۹ : ۱)۔

جو کچھ مال و جائداد اللہ نے اپنے رسول کو بستیوں کے باشندوں سے فے میں دلوایا ہے وہ اللہ کے اور اس کے رسول اور رسول کے رشتہ داروں اور یتامیٰ اور مساکین اور مسافروں کے لیے ہے۔ تاکہ یہ مال صرف تمہارے دولت مندوں ہی کے درمیان چکر نہ لگاتا رہے...... اور اس میں ان نادار مہاجرین کا بھی حصہ ہے جو اپنے گھر بار اور جائدادوں سے بے دخل کر کے نکال دیے گئے ہیں............ اور ان لوگوں کا بھی حصہ ہے جو مہاجرین کی آمد سے پہلے مدینہ میں ایمان لے آئے تھے ...... اور ان آیندہ نسلوں کا بھی حصہ ہے جو بعد میں آنے والی ہیں۔

اس آیت میں نہ صرف ان مصارف کی توضیح کی گئی ہے جن میں اموال فے کو صرف کیا جائے گا، بلکہ صاف طور پر اس مقصد کی طرف بھی اشارہ کر دیا گیا ہے جس کو اسلام نے نہ صرف اموال فے کی تقسیم میں، بلکہ اپنے پورے معاشی نظام میں پیش نظر رکھا ہے یعنی کَیْ لَا یَکُوْنَ

دُوۡلَةً بَيۡنَ الۡاَغۡنِيَاۤءِ مِنۡكُمۡ (مال تمہارے مالداروں ہی میں چکر نہ لگاتا رہے) یہ مضمون جس کو قرآن مجید نے ایک چھوٹے سے جامع فقرے میں بیان کر دیا ہے، اسلامی معاشیات کا سنگ بنیاد ہے۔

۷۔ اقتصاد کا حکم: ایک طرف اسلام نے دولت کو تمام افراد قوم میں گردش دینے اور مالداروں کے مال میں ناداروں کو حصہ دار بنانے کا انتظام کیا ہے، جیسا کہ آپ اوپر دیکھ چکے ہیں۔ دوسری طرف وہ ہر شخص کو اپنے خرچ میں اقتصاد اور کفایت شعاری ملحوظ رکھنے کا حکم دیتا ہے تاکہ افراد اپنے معاشی وسائل سے کام لینے میں افراط یا تفریط کی روش اختیار کر کے تقسیم ثروت کے توازن کو نہ بگاڑیں۔ قرآن مجید کی جامع تعلیم اس باب میں یہ ہے کہ:۔

وَلَا تَجۡعَلۡ يَدَكَ مَغۡلُوۡلَةً اِلٰى عُنُقِكَ وَلَا تَبۡسُطۡهَا كُلَّ الۡبَسۡطِ فَتَقۡعُدَ مَلُوۡمًا مَّحۡسُوۡرًا ۔ (۱۷: ۳)

نہ اپنے ہاتھ کو اپنی گردن سے باندھے رکھ (کہ کھلے ہی نہیں) اور نہ اس کو بالکل ہی کھول دے کہ بعد میں حسرت زدہ بن کر بیٹھا رہ جائے۔

وَالَّذِيۡنَ اِذَاۤ اَنۡفَقُوۡا لَمۡ يُسۡرِفُوۡا وَلَمۡ يَقۡتُرُوۡا وَكَانَ بَيۡنَ ذٰلِكَ قَوَامًا

اللہ کے نیک بندے وہ ہیں کہ جب خرچ کرتے ہیں تو نہ اسراف کرتے ہیں اور نہ بخل برتتے ہیں بلکہ ان دونوں کے درمیان معتدل رہتے ہیں۔

اس تعلیم کا منشا یہ ہے کہ ہر شخص جو کچھ خرچ کرے اپنے معاشی وسائل کی حد میں رہ کر خرچ کرے، نہ اس قدر حد سے تجاوز کر جائے کہ اس کا خرچ اس کی آمدنی سے بڑھ جائے یہاں تک کہ وہ اپنی فضول خرچیوں کے لیے ایک ایک کے آگے ہاتھ پھیلاتا پھرے، دوسروں کی کمائی پر ڈاکے مارے حقیقی ضرورت کے بغیر لوگوں سے قرض لے اور پھر یا تو ان کے قرض مار کھائے یا قرضوں کا بھگتان بھگتنے میں اپنے تمام معاشی وسائل کو صرف کر کے اپنے آپ کو خود اپنے کیے کرتوتوں سے فقراء و مساکین کے

زمرہ میں شامل کر دے۔ نہ ایسا بخیل بن جائے کہ اس کے معاشی وسائل جس قدر خرچ کرنے کی اس کو اجازت دیتے ہوں، اتنا بھی نہ خرچ کرے۔ پھر اپنی حد کے اندر رہ کر خرچ کرنے کے بھی معنی یہ نہیں ہیں کہ اگر وہ اچھی آمدنی رکھتا ہے تو اپنی ساری کمائی صرف اپنے عیش و آرام اور تزک و احتشام پر صرف کر دے، درآں حالیکہ اس کے عزیز، قریب، دوست، ہمسائے مصیبت کی زندگی بسر کر رہے ہوں۔ اس قسم کے خود غرضانہ خرچ کو بھی اسلام فضول خرچی ہی شمار کرتا ہے۔

وَاٰتِ ذَا الْقُرْبٰى حَقَّهٗ وَالْمِسْكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ وَلَا تُبَذِّرْ تَبْذِيْرًا ۔ اِنَّ الْمُبَذِّرِيْنَ كَانُوْٓا اِخْوَانَ الشَّيٰطِيْنِ ۭ وَكَانَ الشَّيْطٰنُ لِرَبِّهٖ كَفُوْرًا ۔ (۱۷: ۳)۔

اور اپنے رشتہ دار کو اس کا حق دے اور مسکین اور مسافر کو۔ فضول خرچی نہ کر۔ فضول خرچ شیطانوں کے بھائی ہیں۔ اور شیطان اپنے رب کا ناشکر ہے۔

اسلام نے اس باب میں صرف اخلاقی تعلیم ہی دینے پر اکتفا نہیں کی ہے، بلکہ اس نے بخل اور فضول خرچی کی انتہائی صورتوں کو روکنے کے لیے قوانین بھی بنائے ہیں، اور ایسے تمام طریقوں کا سدّباب کرنے کی کوشش کی ہے جو تقسیم ثروت کے توازن کو بگاڑنے والے ہیں۔ وہ جوے کو حرام قرار دیتا ہے۔ شراب اور زنا سے روکتا ہے۔ لہو و لعب کی بہت سی مسرفانہ عادتوں کو جن کا لازمی نتیجہ ضیاع وقت اور ضیاع مال ہے، ممنوع قرار دیتا ہے۔ موسیقی کے فطری ذوق کو اس حد تک پہنچنے سے باز رکھتا ہے جہاں انسان کا انہماک دوسری اخلاقی و روحانی خرابیاں پیدا کرنے کے ساتھ معاشی زندگی میں بھی بدنظمی پیدا کرنے کا موجب ہو سکتا ہے اور فی الواقع ہو جاتا ہے۔ جمالیات کے طبعی رجحان کو بھی وہ حدود کا پابند بناتا ہے قیمتی ملبوسات، زر و جواہر کے زیورات، سونے چاندی کے ظروف، اور تصاویر اور مجسموں کے بارے میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جو احکام دیے ہیں ان سب میں دوسرے مصالح کے ساتھ ایک بڑی مصلحت یہ بھی پیش نظر ہے کہ جو دولت

تمہارے بہت سے غریب بھائیوں کی ناگزیر ضرورتیں پوری کر سکتی ہے، ان کو زندگی کے مایحتاج فراہم کر کے دے سکتی ہے۔ اسے محض اپنے جسم اور اپنے گھر کی تزئین اور آرائش پر صرف کر دینا جہالت نہیں، شقاوت اور بدترین خودغرضی ہے۔ غرض اخلاقی تعلیم اور قانونی احکام دونوں طریقوں سے اسلام نے انسان کو جس قسم کی زندگی بسر کرنے کی ہدایت کی ہے وہ ایسی سادہ زندگی ہے کہ اس میں انسان کی ضروریات اور خواہشات کا دائرہ اتنا وسیع ہی نہیں ہو سکتا کہ وہ ایک اوسط درجہ کی آمدنی میں گذر بسر نہ کر سکتا ہو، اور اسے اپنے دائرہ سے پاؤں نکال کر دوسروں کی کمائیوں میں حصہ لڑانے کی ضرورت پیش آئے۔ یا اگر وہ اوسط سے زیادہ آمدنی رکھتا ہو تو اپنا تمام مال خود اپنی ذات پر خرچ کر دے، اور اپنے ان بھائیوں کی مدد نہ کر سکے جو اوسط سے کم آمدنی رکھتے ہوں۔

ایک سوال یہ ایک مرقع ہے جس میں اسلام کے پورے معاشی نظام کو آپ کے سامنے پیش کر دیا گیا ہے۔ اب اس تصویر کو دیکھیے اور بار بار دیکھیے اور بتائیے کہ اس میں آپ سود کو کس جگہ کھپا سکتے ہیں؟ اس کی روح کو دیکھیے، اس کی ساخت کو دیکھیے، اس کے رنگ و روغن کو دیکھیے، اس کے اجزاء اور ان کے باہمی ربط و تعلق کو دیکھیے، اس میں جو معنی اور مقصد پوشیدہ ہے اس کو دیکھیے اس میں کہاں سودی لین دین کی گنجائش یا ضرورت ہے؟ کہاں ایسا رخنہ آپ کو نظر آتا ہے جس کو بھرنے کے لیے بینکنگ اور انشورنس اور پراویڈنٹ فنڈ اور سرمایہ داری کے دوسرے اجزاء کی حاجت ہو؟ کس مقام پر آپ مہاجنی اور ساہوکاری کا رنگ بھرنے اور سرمایہ داری کے خط و خال پیدا کرنے کا موقع پاتے ہیں؟ اگر جواب نفی میں ہے اور یقیناً نفی میں ہونا چاہیے، تو اس کے بعد دوبارہ ایک غائر نظر اس تصویر پر ڈالیے اور بتائیے کہ اس میں اخلاقی، تمدنی اور معاشی نقطۂ نظر سے کہاں آپ کو نقص نظر آتا ہے؟ مَا تَرٰی فِیْ خَلْقِ الرَّحْمٰنِ مِنْ تَفٰوُتٍ

فَارْجِعِ الْبَصَرَ هَلْ تَرٰى مِنْ فُطُوْرٍ ؟ ثُمَّ ارْجِعِ الْبَصَرَ كَرَّتَيْنِ يَنْقَلِبْ إِلَيْكَ الْبَصَرُ خَاسِئًا وَّهُوَ حَسِيْرٌ۔ اخلاق اور تمدن کے بلند تر مصالح کو آپ چھوڑنا چاہتے ہیں تو چھوڑ دیجیے اگر معیشت ہی انسانی زندگی میں ایک اہم چیز ہے تو خالص معاشی حیثیت سے بھی اسلام کی طرف سے ہر اس شخص کو چیلنج ہے جسے علم المعیشت میں نظر بالغ اور ید طولیٰ رکھنے کا گھمنڈ ہو۔ آئے اور اس نظم معیشت کے اصول و فروع میں کوئی خرابی دکھائے، کوئی کمزوری ثابت کرے، اس میں دلائل اور شواہد کی قوت سے کوئی ایسی ترمیم پیش کرے جس کے بغیر یہ نظم بجائے خود ناقص ہو، یا اس سے بہتر کوئی دوسرا نظم معیشت تجویز کرے جس میں فرد اور جماعت کے درمیان حقوق اور مفادات کا اس سے زیادہ صحیح توازن قائم کیا گیا ہو اور انفرادی و اجتماعی فلاح و بہبود کی یکساں رعایت اس سے زیادہ بہتر طریقے سے ملحوظ رکھی گئی ہو۔ اگر یہ بھی نہیں ہو سکتا اور ہم یقین کے ساتھ کہتے ہیں کہ ہرگز نہیں ہو سکتا تو کیا عقل و دانش کا یہی تقاضا ہے کہ آپ اول تو اپنی کمزوری سے اس بہترین نظم معیشت کو چھوڑ کر دنیا کے سب سے بدتر، سب سے زیادہ غلط اور بہ اعتبار نتائج سب سے زیادہ تباہ کن نظم معیشت کی پیروی کریں، اور پھر اس پر نادم بھی نہ ہوں، اپنے ضمیر پر گناہ کا بار بھی نہ رہنے دیں اور اس گناہ کو صواب، اس فسق و عصیان کو طاعت قرار دینے کے لیے آیات قرآنی و احادیث نبوی میں باطل تاویلیں کریں، اور اس شیطانی نظم معیشت کے تمام فاسد ارکان کو لے کر اسلام کے پاک اور مطہر نظام معاشی میں پیوست کرنے کی کوشش کریں، بلالحاظ اس کے کہ اسلام کے اصول اور اس کی روح اور اس کے مزاج سے ان چیزوں کو کتنی ہی شدید نامناسبت ہو۔ پہلے تو آپ حکیم کے بتائے ہوئے نسخے کو پھینک دیتے ہیں، اس کی تدابیر حفظ صحت سے اعراض و انکار کرتے ہیں، جو پرہیز اس نے تجویز کیا ہے اس پر عمل نہیں کرتے پھر جب مرض بڑھتا ہے اور موت سامنے نظر آتی ہے تو اسی حکیم سے کہتے ہیں کہ جس عطائی کے نسخوں نے مجھے بیمار ڈالا ہے

اسی کے نسخوں کی توثیق کر دے، جن بد پرہیزیوں نے مجھے جاں بلب کیا ہے انہی کی اجازت دے دے، جس چیز کو تو نے زہر کہا تھا اسی کو کہدے کہ یہ تریاق ہے! آخر اس بوالعجبی کی انتہا بھی

سود کے متعلق اسلامی احکام یہ ہماری بحث کا سلبی پہلو تھا۔ اب ہم ایجابی حیثیت سے یہ دکھانا چاہتے ہیں کہ "سود" کیا شئے ہے، اس کے حدود کیا ہیں، اسلام میں اس کی ممانعت کے جو احکام وارد ہوئے ہیں وہ کن کن معاملات سے متعلق ہیں، اور اسلام اس کو مٹا کر انسان کے معاشی معاملات کو کس قاعدہ پر چلانا چاہتا ہے۔

ربوا کا مفہوم قرآن مجید میں سود کے لیے "ربوا" کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔ اس کا مادہ "ربو" ہے جس کے معنی ہیں زیادت، نمو، بڑھوتری، اور چڑھنے کا اعتبار ہے۔ رَبَا: بڑھا اور زیادہ ہوا۔ رَبَا فلان الرابیة: وہ ٹیلے پر چڑھ گیا۔ رَبَا فُلانَ السویقَ: اس نے ستو پر پانی ڈالا اور ستو پھول گیا۔ ربا فی حجرہ: اس نے فلاں کی آغوش میں نشو نما پایا۔ اربی الشیئ = چیز کو بڑھایا۔ ربوۃ: بلندی۔ رابیہ: وہ زمین جو عام سطح ارض سے بلند ہو۔ قرآن مجید میں جہاں جہاں اس مادّے کے مشتقات آئے ہیں، سب جگہ زیادت اور علو اور نمو کا مفہوم پایا جاتا ہے، مثلاً:۔

فَإِذَآ أَنزَلْنَا عَلَيْهَا الْمَآءَ اهْتَزَّتْ وَرَبَتْ (۲۲:۱)	جب ہم نے اس پر پانی برسایا تو وہ لہلہا اٹھی اور برگ و بار لانے لگی۔
يَمْحَقُ اللَّهُ الرِّبَوٰا وَيُرْبِي الصَّدَقَاتِ	اللہ سود کا مٹھ مار دیتا ہے اور صدقات کو بڑھاتا ہے
فَاحْتَمَلَ السَّيْلُ زَبَدًا رَّابِيًا (۱۳:۲)۔	جھاگ جو اوپر ابھر آیا تھا اس کو سیلاب بہالے گیا۔
فَأَخَذَهُمْ أَخْذَةً رَّابِيَةً (۶۹:۱)	اس نے ان کو بھر زیادہ سختی کے ساتھ پکڑا۔
أَن تَكُونَ أُمَّةٌ هِيَ أَرْبَىٰ مِنْ أُمَّةٍ (۱۶:۱۳)	تاکہ ایک قوم دوسری قوم سے بڑھ جائے۔

وَاٰوَیْنٰھُمَآ اِلٰی رَبْوَۃٍ (۳:۲۳) ہم نے مریم اور مسیح کو ایک اونچی جگہ پر پناہ دی۔

اسی مادے سے "رِبٰو" ہے اور اس سے مراد مال کی زیادتی ہے، اور اس کا اصل "بڑھ جانا" ہے

چنانچہ اس معنی کی تصریح بھی خود قرآن میں کر دی گئی ہے:۔

وَذَرُوْا مَا بَقِیَ مِنَ الرِّبٰوٓا ..... وَاِنْ تُبْتُمْ فَلَکُمْ رُءُوْسُ اَمْوَالِکُمْ (۲:۳۸) اور جو کچھ تمہارا سود لوگوں پر باقی رہ گیا ہے اسے چھوڑ دو ..... اور اگر تم توبہ کر لو تو تمہیں اپنے راس المال (یعنی اصل رقم لینے) کا حق ہے۔

وَمَآ اٰتَیْتُمْ مِّنْ رِّبًا لِّیَرْبُوَا فِیْٓ اَمْوَالِ النَّاسِ فَلَا یَرْبُوْا عِنْدَ اللّٰہِ (۳۰:۴) اور جو سود تم نے دیا ہے تاکہ لوگوں کے اموال میں بڑھے تو اللہ کے نزدیک اس سے مال نہیں بڑھتا۔

ان آیات سے صاف ظاہر ہے کہ اصل رقم پر جو زیادتی بھی ہو گی وہ "ربو" کہلائے گی۔ لیکن قرآن مجید نے مطلق ہر زیادتی کو حرام نہیں کیا ہے۔ زیادتی تو تجارت میں بھی ہوتی ہے قرآن جس زیادتی کو حرام قرار دیتا ہے وہ ایک خاص قسم کی زیادتی ہے، اسی لیے وہ اس کو "اَلرِّبٰوا" کے نام سے یاد کرتا ہے۔ اہل عرب کی زبان میں اسلام سے پہلے بھی معاملہ کی اس خاص نوعیت کو اسی اصطلاحی نام سے یاد کیا جاتا تھا، مگر وہ "الربٰو" کو بھی ایک قسم کی بیع سمجھتے تھے جس طرح آج کل اس کو سمجھا جاتا ہے۔ اسلام نے آکر بتایا کہ راس المال میں جو زیادتی بیع سے ہوتی ہے وہ اس زیادتی سے مختلف ہے جو "الربٰو" سے ہوا کرتی ہے۔ پہلی قسم کی زیادتی حلال ہے اور دوسری قسم کی زیادتی حرام:۔

ذٰلِکَ بِاَنَّھُمْ قَالُوْٓا اِنَّمَا الْبَیْعُ مِثْلُ الرِّبٰوا وَاَحَلَّ اللّٰہُ الْبَیْعَ وَحَرَّمَ الرِّبٰوا (۲:۳۸) سود خواروں کا یہ حشر اس لیے ہو گا کہ انہوں نے کہا کہ بیع بھی "الربٰو" کے مانند ہے، حالانکہ اللہ نے بیع کو حلال اور الربٰو کو حرام کیا۔

چونکہ "الربو" ایک خاص قسم کی زیادتی کا نام تھا۔ اور وہ معلوم و مشہور تھی، اس لیے قرآن مجید میں اس کی کوئی تشریح نہیں کی گئی، اور صرف یہ کہنے پر اکتفا کیا گیا کہ اللہ نے اس کو حرام کیا ہے اُسے چھوڑ دو۔

جاہلیت کا ربو | زمانۂ جاہلیت میں "الربو" کا اطلاق جس طرز معاملہ پر ہوتا تھا۔ اس کی متعدد صورتیں روایات میں آئی ہیں۔

قتادہ کہتے ہیں جاہلیت کا ربو یہ تھا کہ ایک شخص، ایک شخص کے ہاتھ کوئی چیز فروخت کرتا اور ادائے قیمت کے لیے ایک وقت مقرر تک مہلت دیتا۔ اگر وہ مدت گذر جاتی اور قیمت ادا نہ ہوتی تو پھر وہ مزید مہلت دیتا اور قیمت میں اضافہ کر دیتا۔

مجاہد کہتے ہیں جاہلیت کا ربو یہ تھا کہ ایک شخص کسی سے قرض لیتا اور کہتا کہ اگر تو مجھے اتنی مہلت دے تو میں اتنا زیادہ دوں گا۔ (ابن جریر جلد سوم صفحہ ۶۲)

ابوبکر جصاص کی تحقیق یہ ہے کہ اہل جاہلیت جب ایک دوسرے سے قرض لیتے تو باہم طے ہو جاتا کہ اتنی مدت میں اتنی رقم اصل راس المال سے زیادہ ادا کی جائے گی۔ (احکام القرآن جلد اول)۔

امام رازی کی تحقیق میں اہل جاہلیت کا دستور یہ تھا کہ وہ ایک شخص کو ایک معین مدت کے لیے روپیہ دیتے اور اس سے ماہ بماہ ایک مقررہ رقم سود کے طور پر وصول کرتے رہتے جب وہ مدت ختم ہو جاتی تو مدیون سے راس المال کا مطالبہ کیا جاتا۔ اگر وہ ادا نہ کر سکتا تو پھر ایک مزید مدت کے لیے مہلت دی جاتی اور سود میں اضافہ کر دیا جاتا (تفسیر کبیر جلد دوم صفحہ ۳۵۱)

کاروبار کی یہ صورتیں عرب میں رائج تھیں، انہی کو اہل عرب اپنی زبان میں "الربو" کہتے تھے، اور یہی وہ چیز تھی جس کی تحریم کا حکم قرآن مجید میں نازل ہوا۔

بیع اور ربوٰ میں اصولی فرق اب اس امر پر غور کیجئے کہ بیع اور ربوٰ میں اصولی فرق کیا ہے۔ ربوٰ کی خصوصیات کیا ہیں جن کی وجہ سے اس کی نوعیت بیع سے مختلف ہو جاتی ہے اور اسلام نے کس بنا پر اس کو منع کیا ہے۔

بیع کا اطلاق جس معاملہ پر ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ بائع ایک شے کو فروخت کے لیے پیش کرتا ہے، مشتری اور بائع کے درمیان اس شئے کی ایک قیمت قرار پاتی ہے، اور اس قیمت کے معاوضہ میں مشتری اس شئے کو لے لیتا ہے۔ یہ معاملہ دو حال سے خالی نہیں ہوتا۔ یا تو بائع نے وہ چیز خود محنت کرکے اور اپنا مال اس پر صرف کرکے پیدا کی ہے، یا وہ اس کو کسی دوسرے سے خرید کر لایا ہے۔ دونوں صورتوں میں وہ اپنے راس المال پر جو اسنے خریدنے یا مہیا کرنے میں صرف کیا تھا، اپنے حق المحنت کا اضافہ کرتا ہے اور یہی اس کا منافع ہے۔

اس کے مقابلہ میں ربوٰ یہ ہے کہ ایک شخص اپنا راس المال ایک دوسرے شخص کو دیتا ہے اور یہ شرط کر لیتا ہے کہ میں اتنی مدت میں اتنی رقم تجھ سے راس المال پر زائد لوں گا۔ اس معاملے میں راس المال کے مقابل راس المال ہے، اور مہلت کے مقابلہ میں وہ زائد رقم ہے جس کی تعیین پہلے بطور ایک شرط معاملہ کے کر لی جاتی ہے۔ اسی زائد رقم کا نام سود یا ربوٰ ہے جو کسی خاص مال یا شئے کا معاوضہ نہیں بلکہ محض مہلت کا معاوضہ ہوتا ہے۔ اگر بیع میں بھی قیمت قرار پا چکی ہو، اور پھر مشتری سے یہ شرط طے کی جائے کہ ادائے قیمت میں مثلاً ایک مہینے کی دیر ہونے پر قیمت میں اتنا اضافہ کر دیا جائیگا تو یہ زیادت، سود کی تعریف میں آجائے گی۔

پس سود کی تعریف یہ قرار پائی کہ راس المال پر جو زائد رقم مدت کے مقابلہ میں شرط و تعیین کے ساتھ لی جائے وہ "سود" ہے۔ راس المال پر اضافہ،[۱] اضافہ کی تعیین مدت کے لحاظ سے کیا جانا،[۲] اور معاملہ میں اس کا مشروط ہونا،[۳] یہ تین اجزاء ترکیبی ہیں جن سے

سود بنتا ہے، اور ہر وہ معاملہ جس میں تینوں اجزاء پائے جاتے ہوں، ایک سودی معاملہ ہے۔

بیع اور سود میں اصولی فرق یہ ہے کہ :-

(۱) بائع اور مشتری کے درمیان منافع کا مساویانہ مبادلہ ہوتا ہے کیونکہ مشتری اس چیز سے تمتع حاصل کرتا ہے جو اس نے بائع سے خریدی ہے، اور بائع اپنی اس محنت، ذہانت اور وقت کی اجرت لیتا ہے جس کو اس نے مشتری کے لیے وہ چیز مہیا کرنے میں صرف کیا ہے بخلاف اس کے سودی لین دین میں منافع کا مبادلہ برابری کے ساتھ نہیں ہوتا۔ سود لینے والا تو مال کی ایک مقرر مقدار لیتا ہے جو اس کے لیے بالیقین نفع بخش ہے، لیکن اس کے مقابلہ میں سود دینے والے کو صرف مہلت ملتی ہے جس کا نفع بخش ہونا یقینی نہیں۔ اگر اس نے راس المال اپنی شخصی ضرورتوں پر خرچ کرنے کی غرض سے لیا ہے تب تو مہلت اس کے لیے نافع نہیں، بلکہ یقیناً نقصان دہ ہوگی اور اگر اس نے تجارت یا زراعت یا صنعت وحرفت میں لگانے کی غرض سے لیا ہے تو مہلت میں جس طرح اس کے لیے نفع کا امکان ہے اسی طرح نقصان کا بھی امکان ہے تاہم دینے والا تو بہرحال اس سے ایک مقرر مقدار لیتا ہے، خواہ اس کو اپنے کاروبار میں فائدہ ہو یا نقصان پس سود کا معاملہ یا تو ایک فریق کے فائدے اور دوسرے کے نقصان پر ہوتا ہے، یا ایک کے یقینی اور متعین فائدے اور دوسرے کے غیر یقینی اور غیر متعین فائدے پر۔

(۲) بیع وشراء میں بائع مشتری سے خواہ کتنا ہی زائد منافع لے، بہرحال وہ صرف ایک ہی بار لیتا ہے لیکن سود کے معاملہ میں راس المال دینے والا مسلسل اپنے مال پر منافع وصول کرتا رہتا ہے اور وقت کی رفتار کے ساتھ ساتھ اس کا منافع بڑھتا چلا جاتا ہے مدیون نے اس کے مال سے خواہ کتنا ہی تمتع حاصل کیا ہو، بہرطور اس کا تمتع ایک خاص حد تک ہی ہوگا۔ مگر اس تمتع کے معاوضہ میں دائن جو نفع اٹھاتا ہے اس کے لیے کوئی حد نہیں۔ ہوسکتا ہے کہ وہ اس کی تمام کمائی، اس کے

تمام وسائل ثروت، اس کے تمام ما یحتاج پر محیط ہو جائے اور پھر بھی اس کا سلسلہ ختم نہ ہو۔

(۳) بیع و شراء میں شئے اور اس کی قیمت کا مبادلہ ہونے کے ساتھ ہی معاملہ ختم ہو جاتا ہے اس کے بعد مشتری کو کوئی چیز بائع کو واپس دینی نہیں ہوتی۔ مکان یا زمین یا سامان کے کرایہ میں اصل شئے جس کا منافع دیا جاتا ہے صرف نہیں ہوتی بلکہ برقرار رہتی ہے اور بجنسہ کرایہ دار کو واپس دی جاتی ہے لیکن سود کے معاملہ میں مدیون راس المال سے کر صرف کر چکتا ہے اور پھر اس کو وہ صرف شدہ چیز دوبارہ حاصل کر کے سود کے اضافہ کے ساتھ واپس دینی پڑتی ہے۔

(۴) تجارت اور صنعت و حرفت اور زراعت میں انسان محنت اور ذہانت صرف کرتا ہے اور اس کا فائدہ لیتا ہے۔ مگر سودی کاروبار میں وہ محض اپنا ضرورت سے زائد مال دے کر بلا کسی محنت و مشقت اور صرفِ کمال کے انکی کمائی میں شریک غالب بن جاتا ہے۔ اس کی حیثیت اصطلاحی "شریک" کی نہیں ہوتی جو نفع و نقصان دونوں میں شریک ہوتا ہے، اور نفع میں جس کی شرکت نفع کے تناسب سے ہوتی ہے، بلکہ وہ ایسا شریک ہوتا ہے جو بلا لحاظ نفع و نقصان اور بلا لحاظ تناسب نفع، اپنے مقرر اور مشروط منافع کا دعویدار ہوتا ہے۔

علت تحریم | یہ وجوہ ہیں جن کی بنا پر اللہ تعالیٰ نے بیع کو حلال اور سود کو حرام کیا ہے۔ ان وجوہ کے علاوہ حرمت سود کی دوسری وجوہ بھی ہیں جن کی طرف ہم پہلے اشارہ کر چکے ہیں۔ وہ بخل، خود غرضی، شقاوت، بے رحمی اور زر پرستی کی صفات پیدا کرتا ہے وہ افراد قوم کے درمیان ہمدردی اور امداد باہمی کے تعلقات کو قطع کرتا ہے۔ وہ لوگوں میں روپیہ جمع کرنے اور صرف اپنے ذاتی مفاد کی ترقی پر لگانے کا میلان پیدا کرتا ہے۔ وہ سوسائٹی میں دولت کی آزادانہ گردش کو روکتا ہے۔ بلکہ دولت کی گردش کا رخ الٹ کر ناداروں سے مالداروں کی طرف پھیر دیتا ہے، اس کی وجہ سے جمہور کی دولت سمٹ کر ایک طبقہ کے پاس اکٹھی ہو جاتی ہے، اور یہ چیز

آخر کار پوری سوسائٹی کے لیے بربادی کی موجب ہوتی ہے، جیسا کہ معاشیات میں بصیرت رکھنے والوں سے پوشیدہ نہیں۔ سود کے یہ تمام اثرات ناقابل انکار ہیں، اور جب یہ ناقابل انکار ہیں تو اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اسلام جس نقشے پر انسان کی اخلاقی تربیت، تمدنی شیرازہ بندی اور معاشی تنظیم کرنا چاہتا ہے اس کے ہر ہر جز سے سود کلی منافات رکھتا ہے، اور سودی کاروبار کی ادنیٰ سے ادنیٰ اور بظاہر معصوم سے معصوم صورت بھی اس پورے نقشے کو خراب کر دیتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید میں حق تعالیٰ نے اس قدر سخت الفاظ کے ساتھ سود کو بند کرنے کا حکم دیا کہ:-

اتَّقُوا اللَّهَ وَذَرُوا مَا بَقِيَ مِنَ الرِّبٰوا إِنْ كُنْتُمْ مُؤْمِنِينَ فَإِنْ لَمْ تَفْعَلُوا فَأْذَنُوا بِحَرْبٍ مِنَ اللَّهِ وَرَسُولِهِ۔ (۲: ۲۷۸)	اللہ سے ڈرو اور جو سود تمہارا لوگوں پر باقی ہے اس کو چھوڑ دو اگر تم ایمان رکھتے ہو۔ اور اگر تم نے ایسا نہ کیا تو اللہ اور اس کے رسول سے جنگ کا اعلان قبول کرو۔

حرمت سود کی شدت | قرآن میں اور بھی بہت سے گناہوں کی ممانعت کا حکم آیا ہے اور ان پر سخت وعیدیں بھی ہیں، لیکن اتنے سخت الفاظ کسی دوسرے گناہ کے بارے میں وارد نہیں ہوئے۔ اسی طرح نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی سود کو روکنے کے لیے سخت کوشش فرمائی۔ آپ نے نجران کے عیسائیوں سے جو معاہدہ کیا اس میں صاف طور پر لکھ دیا کہ اگر تم سودی کاروبار کرو گے تو معاہدہ کالعدم ہو جائیگا اور ہم کو تم سے جنگ کرنی پڑیگی۔ بنو مغیرہ کے سودخوار عرب میں مشہور تھے۔ فتح مکہ کے بعد حضور نے ان کی تمام سودی رقمیں باطل کر دیں اور اپنے عامل مکہ کو لکھا کہ اگر وہ باز نہ آئیں تو ان سے جنگ کرو۔ خود حضور کے چچا حضرت عباس ایک بڑے مہاجن تھے۔ حجۃ الوداع میں آپ نے اعلان فرمایا کہ جاہلیت کے تمام سود ساقط کیے جاتے ہیں، اور سب سے پہلے میں خود اپنے چچا عباس کا

سود ساقط کرتا ہوں۔ آپ نے یہاں تک فرما دیا کہ سود لینے والے اور دینے والے، اور اس کی دستاویز کے کاتب، اور اس پر گواہی دینے والے، سب پر اللہ کی لعنت!

اِن تمام احکام کا منشا یہ نہ تھا کہ محض سود کی ایک خاص قسم یعنی یوژری (مہاجنی سود) کو بند کیا جائے، اور اس کے سوا تمام اقسام کے سودوں کا دروازہ کھلا رہے، بلکہ ان سے اصل مقصد سرمایہ دارانہ اخلاق، سرمایہ دارانہ ذہنیت، سرمایہ دارانہ نظام تمدن اور سرمایہ دارانہ نظم معیشت کا کلی استیصال کر کے وہ نظام قائم کرنا تھا جس میں بخل کے بجائے فیاضی ہو، خود غرضی کے بجائے ہمدردی اور امداد باہمی ہو، سود کے بجائے زکوٰۃ ہو، بینک کی جگہ قومی بیت المال ہو، اور وہ حالات ہی سرے سے پیش نہ آئیں جن سے مقابلہ کرنے کے لیے کوآپریٹیو سوسائیٹیوں اور انشورنس کمپنیوں اور پراویڈنٹ فنڈس وغیرہ کی ضرورت پیش آتی ہے۔

اب یہ ہماری اپنی حماقت ہے، کمزوری ہے، بدقسمتی ہے کہ اسلام کا یہ اخلاقی تمدنی اور معاشی نظام بالکل درہم برہم ہو گیا، سرمایہ داری ہم پر مسلط ہو گئی، زکوٰۃ خیرات اور صدقات کی تحصیل اور صحیح مصارف میں ان کو صرف کرنے کے لیے کوئی ادارہ ہم میں باقی نہ رہا، ہمارے مالدار خود غرض اور نفس پرست ہو گئے، ہمارے ناداروں کے لیے کوئی سہارا نہ رہا۔ ہم نے اسلامی اخلاق کو کھو دیا اور اس کی حدود کو ایک ایک کر کے توڑ ڈالا، شراب، جوے اور زناکاری میں ہم مبتلا ہوئے، عیش پسندی اور اسراف کی بدترین صفات ہم میں پیدا ہو گئیں، فضول خرچی کے حیلہ لوازم کو ہم نے اپنی ضروریات زندگی میں داخل کر لیا، سودی قرض کے بغیر ہمارے لیے شادیاں کرنا، موٹریں خریدنا، بنگلے بنوانا، تزئین و آرائش اور عیش و عشرت کے سامان فراہم کرنا محال ہو گیا، امداد باہمی کی اسپرٹ اور عملی تنظیم یکسر مفقود ہو گئی اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہمارے معاشی حالات تنزل پذیر ہو گئے، ہم میں سے ہر شخص کی زندگی کلیۃً اپنے ہی معاشی وسا

پر منحصر ہوگئی اور وہ مجبور ہو گیا کہ اپنے مستقبل کی حفاظت کے لیے اسلام کے اصولوں کو چھوڑ کر سرمایہ داری کے اصولوں کی پیروی کرے بنک میں روپیہ جمع کرائے، انشورنس کمپنی میں بیمہ کرائے، کوآپریٹیو سوسائٹی کا رکن بنے اور بوقت ضرورت سرمایہ دار اداروں سے سود پر قرض لے کے اپنی حاجت رفع کرے۔ بلاشبہ آج یہ سب کچھ ہمارے لیے ناگزیر ہوگیا ہے۔ مگر کیا ان حالات کو پیدا کرنے کی ذمہ داری اسلام پر ہے؟ اگر نہیں ہے اور یقیناً نہیں ہے، اور ہم ان حالات میں صرف اس وجہ سے مبتلا ہوئے ہیں کہ جس معاشی نظام کی تعلیم اسلام نے ہمکو دی تھی اس کے ارکان میں سے ایک ایک کو ہم نے منہدم کر ڈالا ہے، تو کیا یہ جائز ہوگا کہ اسلامی قانون کی خلاف ورزی کرکے جن معاشی مشکلات کو ہم نے خود اپنے لیے پیدا کیا ہے ان کا حل ہم اسلام ہی کے ایک اور قانون کی خلاف ورزی میں تلاش کریں، اور پھر اسلام ہی سے مطالبہ کریں کہ وہ اس خلاف ورزی قانون کی ہم کو اجازت دے دے؟ آخر ہم کو کس نے زکوٰۃ کی تنظیم سے روکا ہے؟ امداد باہمی کی اسلامی تعلیم پر عامل ہونے سے کون ہم کو باز رکھتا ہے؟ اسلام کے قانون وراثت پر عمل کرنے میں کون سدّ راہ ہے؟ سادگی، پرہیزگاری اور کفایت شعاری کی زندگی بسر کرنے میں کونسا امر مانع ہے؟ کون ہم کو مجبور کر رہا ہے کہ اپنی چادر سے زیادہ پاؤں پھیلائیں اور مغربی تہذیب کے مسرفانہ لوازم کو اپنی ضروریات زندگی میں داخل کریں؟ کس نے ہمکو پابند کیا ہے کہ کسب معاش کے جائز ذرائع اختیار کرنے کے بجائے، سرمایہ دار بننے کی ہوس میں حرام خوری کے طریقے اختیار کریں؟ کس نے ہمارے مالداروں کا ہاتھ پکڑ کر ان کو اپنے رشتہ داروں، ہمسایوں، دوستوں، اپنی قوم کی بیواؤں، یتیموں، معذوروں اور محتاجوں کی مدد کرنے سے روکا اور یورپ، امریکہ اور جاپان کے کارخانہ داروں کی طرف اپنی دولت پھینکنے پر مجبور کیا ہے؟ کس نے ہمارے متوسط اور قلیل المعاش

لوگوں پر جبر کیا ہے کہ اپنی شادی اور غمی کی رسموں میں اپنی حد سے بڑھ کر خرچ کریں، امیروں کی ریس کرنے میں اپنے معاشی وسائل سے بڑھ کر شان اور ٹھاٹھ جمائیں، اور اپنی فضول خرچیوں کے لیے سودی قرض لیں؟ یہ سب افعال جو ہم اپنے اختیار سے کر رہے ہیں اسلام کی نگاہ میں جرائم ہیں اگر آج ہم ان جرائم سے باز آجائیں اور اسلام کے معاشی نظام کو پھر سے قائم کرلیں تو ہماری وہ تمام معاشی مشکلات دور ہو سکتی ہیں جو ہم کو ایک دوسرے جرم یعنے سود کھانے اور کھلانے کے جرم پر مجبور کر رہی ہیں۔ مگر جب ہم ان جرائم سے باز نہیں آتے تو اس جرم کو بھی جرم سمجھ ہی کر کیوں نہ کریں جو ان جرائم کے نتیجہ کے طور پر پیدا ہوا ہے؟ جس شخص نے خود پاک اور طیب غذا کو چھوڑ کر اپنے آپ کو ایسے مقام پر پہنچایا ہے جہاں نجاست کے سوا کچھ کھانے کو نہیں ملتا، وہ پیٹ بھر کر نجاست کھائے اور کھلائے۔ مگر وہ اس نجاست کو پاک اور طیب قرار دینے پر کیوں اصرار کرتا ہے؟

پس جیسا کہ ہم ابتدا میں لکھ آئے ہیں سود لینے یا نہ لینے کی بحث تو ایک بعد کی بحث ہے۔ سب سے پہلے تو آپ کو یہ طے کرنا چاہیے کہ اسلام کے معاشی نظام کی پیروی کرنی ہے یا سرمایہ داری نظام کی؟ اگر آپ پہلی صورت کو اختیار کرتے ہیں تو اس میں سودی لین دین کی نہ ضرورت ہے نہ گنجائش کیونکہ اشتراکی روس کی طرح اسلامی معیشت کا بھی تمام کاروبار ان ادارات کی بغیر چلتا ہے جو سودی لین دین کرنے والے ہیں، اور یہ نظام ان لوگوں کو مجرم سمجھتا ہے جو سودی کاروبار کر کے اس کے نظم کو بگاڑنے کی کوشش کرتے ہیں۔ برعکس اس کے اگر آپ دوسری صورت اختیار کرنا چاہتے ہیں تو آپ کا سرمایہ دارانہ نظم معیشت کو اختیار کرنا بحیثیت مجموعی اسلام کے خلاف ایک بغاوت ہے، اور اس بغاوت کی حالت میں آپ کو اسلام کے معاشی قوانین میں سے وہ تمام قانون توڑنے پڑیں گے جو اصول سرمایہ داری کے خلاف ہیں۔ اب آپ کی خواہش یہ ہے کہ آپ قوانین اسلامی کی خلاف ورزی بھی کریں، نظام سرمایہ داری کی پیروی بھی کریں اور اسلام کی نظر میں گنہگار بھی نہ ہوں، در حقیقت یہ معنی رکھتی ہے کہ اسلام کی پیروی چھوڑ کر آپ خود اسلام کو اپنا پیرو بنانا چاہتے ہیں اور آپ کی خواہش ہے کہ وہ محض آپ کے اپنے دائرہ میں رکھنے کی خاطر اپنے اصول کو بدل کر سرمایہ دارانہ نظم معیشت کے اصول اختیار کرے۔ (باقی)

ایک حدیث پر اعتراض اور اس کا جواب

جناب احمد عبدالعزیز صاحب استاذ معاشیات، ورنگل کالج، ہمکنڈہ اپنے ایک عنایت نامے میں تحریر فرماتے ہیں :-

"میں نے تجرید البخاری مؤلفہ علامہ حسین بن مبارک متوفی ۹۰۰ھ کے اردو ترجمہ میں جو فیروز الدین صاحب نے لاہور سے شائع کیا ہے، صفحہ (۸۱) پر ایک حدیث کا مطالعہ کیا ہے جو حسب ذیل ہے:

حضرت انس بن مالک سے روایت ہے کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم اپنی ازواج مطہرات کے پاس ایک ہی ساعت کے اندر رات اور دن میں دورہ کر لیتے تھے اور وہ گیارہ تھیں۔ (ایک روایت میں آیا ہے کہ نو تھیں) حضرت انس سے پوچھا گیا کہ کیا آپ ان سب کی طاقت رکھتے تھے۔ وہ بولے ہم تو کہا کرتے تھے کہ آپ کو تیس مردوں کی قوت دی گئی ہے۔

جناب والا سے میں توقع رکھتا ہوں کہ براہ کرم مذکورۂ بالا حدیث کی صحت پر روشنی ڈالیں۔ کیا یہ امر واقعہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک ہی ساعت کے اندر اپنی جملہ ازواج مطہرات سے مقاربت کی ہے؟ اور اگر مقاربت کی ہے تو حضرت انس کو کس طرح اس کا علم ہو گیا؟ کیا حضور نے حضرت انس سے اس مقاربت کا ذکر فرمایا؟ یا ازواج مطہرات میں سے کسی نے اس ازدواجی تعلق کا راز فاش کیا؟ یا حضرت انس کو آنحضرت کی خلوت کا ہر وقت علم ہوتا رہتا تھا؟ یا حضرت انس خود اس خلوت کا علم حاصل کرنے کی کھوج میں لگے رہتے تھے؟ آخر حضور کو اس قدر عجلت مقاربت کی کیا ضرورت درپیش تھی جب کہ آپ کی

باریاں مقرر تھیں؟ اور کیا بوقت واحد اس قدر کثرت مقاربت سے حضور کی صحت و توانائی پر کچھ بھی اثر نہ پڑتا تھا؟

براہ کرم مندرجہ بالا استفسارات کے جوابات عنایت فرما کر ممنون فرمایا جائے۔"

اس سوال کا جواب خط کے ذریعے سے دیا جا سکتا تھا۔ مگر حال میں دیوبند کے ایک فاضل بزرگ نے اپنے ایک مضمون میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی کثرت ازواج پر مخالفین کے اعتراضات کا جواب دیتے ہوئے اس حدیث سے استدلال کیا تھا، اور اس پر شمالی ہند کے بعض رسالوں میں بہت تلخ اور حدِ تہذیب و شرافت سے گزری ہوئی نکتہ چینی کی گئی تھی، اس لیے ہم اس سوال کو رسالے میں درج کر کے اس کا جواب دے رہے ہیں تاکہ اگر دوسرے لوگوں کے دلوں میں بھی اس پر کچھ شکوک ہوں تو ان کا ازالہ ہو جائے۔

یہ حدیث بخاری میں دو جگہ نقل کی گئی ہے۔ ایک کتاب الغسل میں باب اذا جامع ثم عاد ومن دار علی نساءہ فی غسل واحد کے تحت۔ دوسرے کتاب النکاح میں باب من طاف علی نسائہ فی غسل واحد کے تحت۔ پہلے باب کی حدیث کے الفاظ یہ ہیں۔

کان النبی صلی اللہ علیہ وسلم یدور علی نسائہ فی الساعۃ الواحدۃ من اللیل والنہار وھن احدی عشرۃ۔ قال قلت لانس (وکان یطیقہ، قال کنا نتحدث (انہ اعطی قوۃ ثلاثین۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم رات اور دن میں اپنی بیویوں کے پاس ایک ہی وقت میں ہو آتے تھے، اور وہ گیارہ بیویاں تھیں۔ قتادہ کہتے ہیں کہ میں نے انس سے کہا کیا آپ میں اتنی طاقت تھی؟ انس نے جواب دیا ہم آپس میں کہا کرتے تھے کہ حضور کو ۳۰ مردوں کی قوت عطا کی گئی ہے۔

دوسرے باب میں سعید بن ابی عروبہ، قتادہ کے حوالہ سے حضرت انس کی یہ حدیث بیان

کرتے ہیں کہ:-

ان النبی صلے اللہ علیہ وسلم کان یطوف علی نسائہ فی اللیلۃ الواحدۃ ولہٗ یومئذٍ تسع نسوۃ -
نبی صلی اللہ علیہ وسلم اپنی بیویوں کے پاس ایک ہی رات میں چکر لگا لیتے تھے اور اس زمانہ میں آپ کی نو بیویاں تھیں۔

دونوں حدیثوں سے مقصود صرف یہ بیان کرنا ہے کہ اگر کوئی شخص ایک سے زائد مرتبہ مباشرت کرے تو ہر بار غسل کرنا لازم نہیں ہے، بلکہ سب کے لیے ایک ہی غسل کافی ہو سکتا ہے۔ رہا ازواج مطہرات کا نو یا گیارہ ہونا اور حضور کا ان سب کے پاس شب باش ہونے کی طاقت رکھنا، تو اس کا ذکر محض ضمناً آگیا ہے۔ اسی لیے امام بخاری نے دونوں جگہ ترجمۃ الباب میں غسلِ واحد لکھا ہے۔

نسائی نے بھی باب اتیان النساء قبل احداث الغسل میں حضرت انس سے اسی مضمون کی دو روایتیں نقل کی ہیں۔ ایک میں طاف علی نسائہٖ فی لیلۃٍ بغسلٍ واحدٍ ہے۔ یعنی ایک رات آپ نے اپنی بیوں کے پاس چکر لگایا اور صرف ایک مرتبہ غسل فرمایا۔ دوسری حدیث میں ہے کان یطوف علی نسائہٖ فی غسلٍ واحدٍ۔ یعنی آپ اپنی بیوں کے پاس ہو آتے تھے اور پھر ایک بار غسل فرماتے تھے۔

ابو داؤد نے ایک حدیث باب فی الجنب یعود میں نقل کی ہے جس میں طاف ذات یومٍ علی نسائہٖ فی غسلٍ واحدٍ ہے یعنی ایک روز آپ نے اپنی بیوں کے پاس چکر لگایا اور پھر ایک مرتبہ غسل کیا۔ اس کے بعد حضرت ابو رافع سے یہ حدیث نقل کی ہے:۔

طاف ذات یومٍ علی نسائہٖ یغتسل عند ھٰذا وعند ھٰذا۔ قال فقلت یا رسول اللہ الا تجعلہ غسلاً واحداً
ایک روز حضور نے اپنی بیویوں کے پاس چکر لگایا اور ہر ایک کے ہاں الگ غسل کیا۔ میں نے عرض کیا یا رسول اللہ آپ ایک ہی غسل کیوں نہیں فرماتے۔ حضور نے

قال ھذا ازکی واطیب واطھر۔ فرمایا یہ زیادہ پاکیزہ اور صاف ستھرا طریقہ ہے۔

پھر ایک حدیث حضرت ابو سعید خدری سے نقل کی ہے جس کے الفاظ یہ ہیں۔

اذا اتی احدکم اھلہ ثم ارادہ ان یعاود فلیتوضأ بینھما وضوءً جو شخص تم میں سے اپنی بیوی کے پاس جائے پھر دوبارہ مقاربت کرنا چاہے تو دونوں مقاربتوں کے درمیان وضو کرے۔

یہی حدیث ترمذی نے بھی ابواب الطہارت میں نقل کی ہے۔ ان تینوں قسم کی حدیثوں کو جمع کرنے سے مسئلہ یہ نکلتا ہے کہ اعادۂ مقاربت کی صورت میں زیادہ پاکیزہ طریقہ یہ ہے کہ ہر بار جدا گانہ غسل کیا جائے اگر یہ نہ ہو سکے تو کم از کم وضو کر لیا جائے لیکن ایسا کرنا واجب نہیں ہے۔ دو یا زائد مقاربتوں کے بعد صرف ایک مرتبہ غسل کر لینے سے بھی شرط طہارت پوری ہو جاتی ہے۔

اب شبہات کو دل میں جگہ دینے سے قبل حسب ذیل امور کو ذہن نشین کر لیجئے۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم ایک ایسی قوم میں مبعوث ہوئے تھے جو تہذیب و تمدن کے ابتدائی درجہ میں تھی۔ آپ کے سپرد اللہ تعالیٰ نے صرف یہی کام نہیں کیا تھا کہ ان کو عقائد صحیحہ کی تعلیم دیں بلکہ یہ خدمت بھی آپ کے سپرد تھی کہ ان کو انسان بنائیں، شایستہ اخلاق، پاکیزہ معاشرت، مہذب تمدن، نیک معاملات اور عمدہ آداب کی تعلیم دیں، اور ہر حیثیت سے ان کی زندگی سنوار دیں۔ یہ مقصد محض وعظ و تلقین اور قیل و قال سے پورا نہیں ہو سکتا تھا۔ ۲۳ سال کی مختصر مدت حیات میں ایک پوری قوم کو وحشت کے اسفل مقام سے اٹھا کر تہذیب کے اعلیٰ مرتبہ پر پہنچا دینا اس طرح ممکن نہ تھا کہ محض چند لگے بندھے اوقات میں ان کو بلا کر کچھ زبانی ہدایات دیدی جاتیں۔ اس کے لیے ضرورت تھی کہ آپ انسانیت کا ایک مکمل نمونہ بن کر اپنی پوری زندگی کو ان کے لیے سراسر ہدایت اور مجسم رہنمائی بنا دیتے۔ چنانچہ آپ نے ایسا ہی کیا۔ یہ آپ کا انتہائی ایثار تھا کہ آپ نے

اپنی حیات طیبہ کے ہر شعبے کو قوم کی تعلیم کے لیے پبلک کر دیا، اور اس میں کسی چیز کو بھی پرائیویٹ نہ رکھا، حتٰی کہ ان معاملات کو بھی جنھیں ہر شخص پرائیویٹ رکھنا چاہتا ہے۔ آپ نے لوگوں کو اجازت دی کہ وہ رفتار میں، گفتار میں، نشست و برخاست میں، سونے اور جاگنے میں، خانگی معاشرت میں، عبادات اور معاملات میں، غرض ہر چیز میں آپ کے عمل کو دیکھیں، دیکھنے والوں سے سنیں، جاننے والوں سے پوچھیں، خود آپ سے دریافت کریں اور اپنی زندگی کو اس مثالی زندگی کے نمونے پر ڈھالنے کی کوشش کریں۔ آپ کی ازواج مطہرات کو بھی عام اجازت تھی کہ خلوت میں آپ کا جو کچھ طرز عمل دیکھیں اس سے عورتوں اور مردوں سب کو آگاہ کریں، تاکہ لوگوں کی صرف ظاہری زندگی ہی نہیں، باطنی اور مخفی زندگی بھی تہذیب و شائستگی اور طہارت و نفاست کے زیور سے آراستہ ہو جائے۔ اسی غرض کے لیے ازواج مطہرات نے حضور کی پرائیویٹ زندگی کے ایسے معاملات بھی لوگوں کو بتانے میں دریغ نہ کیا جن کو عام طور پر میاں اور بیوی کے سوا کوئی نہیں جانتا، اور نہ کوئی گوارا کرتا ہے کہ لوگ اس کو جانیں۔ اللہ تعالیٰ نے اس تعلیم میں آسانی پیدا کرنے کے لیے ازواج مطہرات اور افراد امت کے درمیان ماں اور بیٹوں کا رشتہ قائم کیا، اور ان کو افراد امت کے لیے حرام کر دیا، تاکہ مائیں اپنے بیٹوں سے کھل کر بات چیت کریں، اور ان کے روحانی باپ کی حرکات و سکنات میں سے ہر چیز کو ان کے سامنے تقلید و تاسی کے لیے، حدود حلال و حرام کی واقفیت کے لیے، پاک اور ناپاک، شائستہ اور ناشائستہ کی تمیز کے لیے بیان کریں پھر باوجودیکہ حضور طبعاً انتہا درجہ کے شرمیلے اور حیادار تھے، آپ نے تعلیم کے لیے حیا کے پردے کو اٹھا دیا اور ہر قسم کے معاملات میں اپنی روحانی اولاد کو، جن میں بیٹے اور بیٹیاں سب شامل تھے خود ہدایات دیں، ان کو اجازت دی کہ جو کچھ چاہیں پوچھیں، اور ان کو موقع دیا کہ آپ کے طرز عمل کو دیکھ کر معلوم کریں کہ ایک پاکیزہ اور مہذب اور شائستہ زندگی کیسی ہوتی ہے۔

اسی تعلیم کا ایک شعبہ طہارت جسم و لباس بھی تھا۔ اہل عرب تو خیر وحشی تھے آج جن قوموں کو تہذیب و تمدن کے آسمان پر متمکن ہونے کا دعویٰ ہے ان کا حال آپ کیا دیکھ رہے ہیں۔ غذا کے بعد منہ کی صفائی سے ناواقف، رفع حاجت کے بعد جسم کی طہارت سے نابلد، کھڑے کھڑے پیشاب کیا اور پتلون کے بٹن لگا لیے، کموڈ پر سے اٹھے اور ٹب میں اتر گئے۔ پھر تعلقات مرد و زن میں تو ان کی ناشائستگی اور بے حیائی اور ناپاکی اس حد سے گذری ہوئی ہے کہ شرفا کی صحبت میں اس کا ذکر بھی کیا جا سکے۔ یہ حال جب ان ترقی یافتہ قوموں کا ہے تو اُس قوم کا کیا حال ہوگا جو تمدن کے بالکل ابتدائی درجہ میں تھی۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے تو آپ نے نہ صرف ان کے نفوس کا تزکیہ فرمایا، بلکہ اُن کو طہارت جسم و لباس کے طریقے بھی سکھائے، ان میں پاکیزگی کا نفیس ذوق پیدا کیا، ان میں نجاست اور طہارت کی تمیز پیدا کی، زندگی بسر کرنے کے گندے گھناونے ناشائستہ اور بیہودہ طریقوں کو موقوف کر کے اپنے قول اور عمل سے ان کے مردوں اور ان کی عورتوں کو صفائی نفاست اور نظافت کے باقاعدہ آداب کا خوگر بنایا۔ اسی کے لیے ناگزیر تھا کہ حضور خود اپنی پرائیویٹ زندگی کو ایک حد تک ان کے سامنے بے پردہ کر دیتے تاکہ وہ ان تمام آداب کو سیکھیں اور ان کی پیروی کریں۔ لوگ حدیث کی کتابوں میں امہات المومنین اور دوسرے صحابہ و صحابیات کی زبان سے اور خود حضور کی زبان سے اس قسم کے مسائل پڑھتے ہیں تو اعتراض جڑ دیتے ہیں کہ یہ باتیں خلاف حیا ہیں، لیکن وہ غور کریں تو ان کو معلوم ہو کہ درحقیقت ایک بہت بڑا ایثار تھا جو حضور نے محض اپنی امت کی خاطر گوارا فرمایا۔ جس ذات پاک کی حیا کا یہ عالم تھا کہ اس کی شریک زندگی تک کو کبھی اُسے برہنہ دیکھنے کا اتفاق نہ ہوا حتی کہ جس نے کبھی تنہائی میں بھی برہنہ ہونے کو پسند نہ کیا، اس نے محض اپنی امت کو شائستگی کی تعلیم دینے کے لیے اپنی بیویوں کو اجازت دی کہ اس کی پرائیویٹ زندگی کے مخفی سے مخفی واقعات تک کو

پبلک کردیں اور اپنے خدام خاص کو موقع دیا کہ جہاں تک اندرونی حالات سے واقف ہو سکتے ہوں واقف ہوں، اور لوگوں تک ان حالات کو پہنچائیں۔ کیا یہ کوئی معمولی ایثار تھا؟ اور یہ اسی ایثار کا نتیجہ ہے کہ نہ صرف اہل عرب بلکہ دنیا کے کروڑہا کروڑ مسلمانوں کی پرائیویٹ زندگی، صفائی جسم اور طہارت لباس اور پاکیزگی اطوار، اور صنفی معاملات میں شائستگی و نظافت کے ایک عام ضابطہ کی پابند ہو گئی۔ ورنہ اگر ان معاملات کو محض شخصی ذوق اور تمیز پر چھوڑ دیا جاتا تو ہمارے اکثر افراد کا حال اپنی زندگی کے مخفی شعبوں میں جانوروں سے ملتا جلتا ہوتا، کیونکہ ان شعبوں کے متعلق انسان کی تعلیم و تربیت کا کوئی انتظام آج بھی دنیا میں کہیں نہیں ہے۔

یہ تو ان شبہات کا جواب ہے جو لائق مستفسر نے حضور کی پرائیویٹ زندگی کے اسرار سے حضرت انس کی واقفیت پر ظاہر کئے ہیں۔ اب ہم سوال کے دوسرے حصہ کی طرف توجہ کرتے ہیں۔

جتنی حدیثیں ہم نے ابتدا میں نقل کی ہیں۔ ان میں سے بعض میں کان یطوف یا کان یدور کے الفاظ آئے ہیں جن کا مفہوم صرف یہ ہے کہ کبھی کبھار حضور کی ازدواجی زندگی میں ایسا بھی ہوا ہے کہ آپ ایک رات میں تمام ازواج مطہرات کے پاس تشریف لے گئے ہیں۔ رہی یہ بات کہ آپ نے سب کے ساتھ ہم بستری بھی فرمائی تھی تو حدیث کے الفاظ اس باب میں صریح نہیں ہیں۔ زیادہ سے زیادہ ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ حضرت انس نے ایسا قیاس کیا ہو گا جو ضروری نہیں کہ صحیح ہو۔ حضرت انس جب حضور کی خدمت میں داخل ہوئے ہیں تو دس سال کے بچے تھے، اور آپ کے وصال کے وقت انکی عمر ۲۰ سال کی تھی اس عمر کے ایک نوجوان کا قیاس ان معاملات میں چنداں قابل اعتبار نہیں۔ خصوصاً ایسی حالت میں جب کہ ان کا اصل مقصد محض ایک

فقہی مسئلہ کی تحقیق تھا، نہ کہ نفس معاملہ کی کھوج لگانا۔ پھر یہ امر بھی قابل لحاظ ہے کہ حضور کی ازواج مطہرات میں سے ایک یعنی زینب بنت خزیمہ رضی اللہ عنہا ۳ھ میں حضور سے بیاہی گئیں اور صرف دو تین مہینہ زندہ رہ کر انتقال فرما گئیں۔ دوسری بیوی حضرت سودہ ضعیف العمر تھیں اور اپنی باری حضرت عائشہؓ کو دے چکی تھیں۔ ان دو کو الگ کرنے کے بعد ۴ھ میں حضور کی صرف تین بیویاں تھیں۔ ۵ھ میں ایک کا اضافہ ہوا۔ ۶ھ میں ایک کا اور اضافہ ہوا۔ ۷ھ میں مزید تین ازواج حرم نبوی میں داخل ہوئیں۔ اس طرح آخر عمر میں حضور کی صرف آٹھ بیویاں ایسی تھیں جن کے ساتھ آپ کے شب باش ہونے کا گمان کیا جا سکتا ہے۔ اس سے بھی اس قیاس کی کمزوری ظاہر ہوتی ہے جو مجملاً ۹ یا ۱۱ ازواج کے ساتھ ہم بستر ہونے کے متعلق قائم کیا گیا ہے۔

بدرجۂ آخر یہ کہا جا سکتا ہے کہ حضور نے اپنی زندگی کے آخری تین برسوں میں ہر بیوی کے ساتھ ایک ہی رات شب باشی کی۔ اگر یہ واقعہ بھی ہو، تو ایک ایسے تندرست اور صحیح القویٰ انسان کے لیے یہ امر کچھ بھی فوق العادہ نہیں جس نے تمام عمر تقویٰ اور پرہیزگاری کی زندگی بسر کی ہو اور اپنے جسم کی قوتوں کو خیالات فاسدہ اور افعال قبیحہ میں کبھی ضائع نہ کیا ہو۔ یہ امر اگر تعجب انگیز ہو سکتا ہے تو ان کے لیے جنہوں نے جوانی میں اپنی قوتیں ضائع کیں اور بڑھاپا آنے سے پہلے بوڑھے ہو گئے۔ حضور ایک کامل انسان تھے۔ تمام قوتیں آپ کے اندر غایت درجہ کے اعتدال پر تھیں۔ ایک اعلیٰ درجہ کا دماغ رکھنے والے انسان میں رجولیت کی قوت کا بھی کمال درجہ پر ہونا ایک طبی حقیقت ہے جس سے کوئی انکار نہیں کر سکتا۔ پھر اس طاقت کی حفاظت آپ نے ایسی کی کہ ساری جوانی صرف ایک بیوی کے ساتھ گذار دی۔ اور کبھی آپ کی پرہیزگاری میں ذرہ برابر فرق نہ آیا۔ پچاس کے لگ بھگ عمر میں آپ

اللہ تعالیٰ کے حکم سے اپنے مخالفین کو چیلنج دیتے ہیں کہ فَقَدْ لَبِثْتُ فِيكُمْ عُمُرًا مِّن قَبْلِهِ - میں تمہارے درمیان ایک عمر گذار چکا ہوں، کسی نے میرے کیرکٹر میں کوئی خرابی دیکھی ہو تو بتائے۔ مگر وہ گروہ جو حضور کی جان کے دشمن، خون کے پیاسے تھے، ان میں سے بھی کوئی یہ کہنے کی جرأت نہ کرسکا کہ محمدؐ! فلاں موقع پر تم سے فلاں کمزوری سرزد ہوئی تھی۔ پس ایک طرف کمال رجولیت کے ساتھ اس پرہیزگاری کو دیکھتے ہوئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ آپ کا آخر عمر میں اتنی عورتوں کے ساتھ شب باشی پر قادر ہونا کوئی فوق العادہ بات نہیں ہے، اور دوسری طرف اس قدرت کے باوجود عہد شباب میں آپ کے کمال تقویٰ کو دیکھ کر ہم اندازہ کرسکتے ہیں کہ حضور کس قدر ضابط تھے اور اپنے نفس کو قابو میں رکھنے کی کتنی زبردست طاقت آپ نے پائی تھی۔

رہی وہ بات جو حضرت انس نے فرمائی ہے کہ آپ کو تیس۳۰ یا چالیس مردوں کی قوت عطا کی گئی تھی، تو وہ نہ حضور کا کوئی قول ہے، نہ کوئی مستند بات۔ حضرت انس خود فرماتے ہیں کہ ہم آپس میں ایسا کہا کرتے تھے۔ ظاہر ہے کہ وہ اس وقت نوجوان تھے اور اپنے ہم عمر دوستوں ہی میں اس قسم کی گفتگو کرتے ہوں گے۔ عنفوان شباب میں عموماً لوگ رجولیت کی زیادتی کو خاص اہمیت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ پھر حضرت انس تو اُس زمانہ کی عربی سوسائٹی کے ایک نوجوان تھے جس میں رجولیت کی زیادتی انسانیت کا ایک قابل فخر جوہر سمجھی جاتی تھی۔ اگر انہوں نے اپنے محبوب آقا میں جس کی غیر معمولی شخصیت سے وہ بے حد مرعوب بھی تھے، اس فخر کے قابل جوہر کا ادعا کیا تو یہ بالکل ایک امر فطری ہے۔ بڑے آدمیوں کے ساتھ ہمیشہ ایسا ہوا ہی کرتا ہے کہ جو لوگ ان کی غیر معمولی شخصیتوں سے بہت زیادہ متاثر ہوتے ہیں وہ ان کی ذات میں فوق البشری طاقتوں کے معتقد ہو جاتے ہیں۔ مگر ایسے معتقدات اس قابل نہیں ہوتے کہ ان کو حجت بنا کر ان پر استدلال کی عمارتیں کھڑی کی جائیں۔

حضرت انس نے تو صرف اسی قدر کہا کہ حضور کو ۳۰ یا ۴۰ مردوں کی طاقت عطا کی گئی تھی۔ اس سے کہیں بڑھ کر بعض دوسری روایتوں میں جن کو ابونعیم اور احمد اور نسائی اور حاکم نے نقل کیا ہے یہ بیان کیا گیا ہے کہ یہ چالیس مرد جن کی قوت حضور کو عنایت کی گئی تھی دنیا کے نہیں بلکہ جنت کے مرد ہیں، اور جنت کے ہر مرد کو دنیا کے سو مردوں کے برابر قوت حاصل ہوگی۔ اس طرح چالیس کو سو سے ضرب دے کر حساب لگا لیا گیا کہ حضور میں چار ہزار مردوں کی قوت تھی۔ یہ سب باتیں خوش عقیدگی پر مبنی ہیں، اور ایسے لوگوں نے کہی ہیں جو آنحضرت علیہ الصلوٰۃ والسلام کی عظمت سے کمال درجہ متاثر ہو کر آپ کے اندر ایسی تمام فوق البشری طاقتوں کا اعتقاد رکھتے تھے جن کو نیک نیتی کے ساتھ وہ فخر کے قابل سمجھتے تھے۔ انہی باتوں کو ایک فاضل بزرگ نے، جن کے علم و فضل اور تقویٰ کا پورا پورا احترام ہمارے دل میں ہے اپنے ایک مضمون میں نقل کر دیا، اور استدلال کی عمارت اس طرح قائم کی کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ۴ ہزار مردوں کی طاقت رکھتے تھے، اور اس طرح ۱۶ ہزار بیویاں رکھنے کے مستحق تھے، مگر آپ نے صرف گیارہ بیویوں پر قناعت فرمائی۔ یہ بات اگرچہ حسن عقیدت کے رنگ میں کہی گئی تھی، لیکن ایسی بات خواہ کسی کے قلم سے اور کسی نیت سے نکلے، بہرحال ہم یہ کہنے سے باز نہیں رہ سکتے کہ اللہ کے نبی کی قوت باہ کا حساب لگانا مذاق سلیم پر بھی بار ہے، کجا کہ اس کو دشمنان اسلام اور متکلمین اور مذبذبین کے مقابلہ میں حجت کے طور پر لایا جائے اور ان کے سامنے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو کرشن اور ہندو دیوتاؤں کے رنگ میں پیش کر کے یہ امید کی جائے کہ اس قسم کی باتوں سے ان کے دلوں میں نور ایمان پیدا ہوگا۔ آنحضرت کی کثرت ازواج پر مخالفین کے اعتراضات کی تردید بہت سے قوی دلائل سے ہو سکتی تھی۔ ان سب کو چھوڑ کر یہ طرز استدلال اختیار کرنا یقیناً افسوس ناک ہے، خصوصاً ایسے زمانے میں جب کہ علم اور علماء کے دشمن ذرا ذرا سی لغزش پر

سب وشتم اور بدزبانی کے تیر چلانے کے لیے ہر وقت مستعد بیٹھے رہتے ہیں۔

قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے ہدایت فرمائی ہے کہ دعوت اسلام میں "حکمت" کو ملحوظ رکھنا سب باتوں پر مقدم ہے۔ اُدْعُ اِلٰی سَبِیْلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ۔ مگر یہ دیکھ کر افسوس ہوتا ہے کہ اس ہدایت کی پیروی میں ہمارے اکابر تک سے لغزشیں ہو رہی ہیں۔ اور ان کی وجہ سے علماء دین کا وقار روز بروز کم ہوتا چلا جاتا ہے۔

تقریظ و انتقاد

ترکی میں مشرق و مغرب کی کشمکش

خطبات خالدہ ادیب خانم

یہ خالدہ ادیب خانم کے ان آٹھ خطبات کا اردو ترجمہ ہے جو موصوفہ نے جامعہ ملیہ اسلامیہ کی دعوت پر دہلی میں دیے تھے۔ جامعہ کے فاضل پروفیسر، ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب نے ان خطبات کو اردو کا جامہ پہنایا ہے اور چھوٹی تقطیع کے تقریباً (۳۰۰) صفحات میں اس مجموعہ کو مکتبہ جامعہ ملیہ نے شائع کیا ہے قیمت دو روپیہ ملنے کا پتہ قرول باغ دہلی۔

دنیائے اسلام میں اس وقت دو ملک ایسے ہیں جن کو دو مختلف حیثیتوں سے مسلمانان عالم کی پیشوائی کا مرتبہ حاصل ہے: ذہنی حیثیت سے مصر، اور سیاسی حیثیت سے ترکی۔ مصر کے ساتھ امم اسلامیہ کے تعلقات نسبتاً زیادہ گہرے ہیں، کیونکہ اس کی زبان ہماری بین الملی زبان، عربی ہے، اس کا لٹریچر تمام دنیا کے مسلمانوں میں پھیلتا ہے، اس کے ذہنی اثرات چین سے مراکش تک پہنچتے ہیں، اور وہی مسلمان قوموں کے درمیان ربط اور تفاہم اور واقفیت حالات کا سب سے بڑا ذریعہ ہے۔ بخلاف اس کے ترکی قوم کی مجاہدانہ زندگی، اور مغربی تقدمات کے مقابلہ میں اس کی شجاعانہ مدافعت، اور ناموس ملی کے لیے اس کی قربانیوں کا سکہ تو بلاشبہ تمام عالم اسلامی پر بیٹھا ہوا ہے، اور اسی وجہ سے اس کو مسلمانوں میں سرداری اور پیشوائی کا منصب حاصل ہے لیکن زبان کی اجنبیت، اور ربط و تفاہم کے فقدان نے ترکی اور اکثر ممالک اسلامیہ کے درمیان ایک گہرا پردہ حائل کر دیا ہے جس کے

سبب سے ترکی قوم کے ذہنی ارتقاء اور اس کی دماغی ساخت اور اس کے تمدنی، سیاسی، مذہبی اور علمی تحولات کے متعلق ہماری واقفیت بہت محدود ہے۔ خصوصاً حال کے دس بارہ برسوں میں جو انقلابات ٹرکی میں رونما ہوئے ہیں۔ ان کے باطنی اسباب اور ان کی اصلی روح کو جاننے اور سمجھنے کا موقع تو ہمکو بہت ہی کم ملا ہے بہت سے لوگ ترکوں سے سخت ناراض ہیں، بعض ان کے ساتھ حسن ظن رکھتے ہیں۔ بعض ان کی مغربیت کو اپنی مغرب پرستی کے لیے بُرھان قاطع بنائے بیٹھے ہیں۔ مگر مستند معلومات کسی کے پاس بھی نہیں ہیں، اور جو تھوڑی بہت معلومات ہیں بھی تو وہ ترکی جدید کی روح کو سمجھنے کے لیے کافی نہیں ہیں۔

اس حالت میں ہم اس کو خوش قسمتی سمجھتے ہیں کہ خود ترکی جدید کے معماروں میں سے ایک ایسی ہستی نے ہندوستان آکر ہمارے سامنے اپنی قوم کے باطن کو ظاہر کیا ہے جو انقلاب کے اسٹیج کی محض ایکٹرس ہی نہ تھی، بلکہ اس انقلاب کی محرک طاقتوں میں سے ایک طاقت تھی، اور اس کے ساتھ عالمانہ نظر، اور فلسفیانہ فہم، اور مفکرانہ تعمق بھی رکھتی تھی۔ اس کی بدولت پہلی مرتبہ ہمیں ٹرکی کو سمجھنے کا موقع ملا ہے۔ اس نے ترکی جدید کی روح کو ہمارے سامنے بے نقاب کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس نے صداقت اور دیانت کے ساتھ ہم کو بتایا ہے کہ جو قوم آج دنیائے اسلام کی نہ صرف سیاسی رہنمائی کر رہی ہے، بلکہ ذہنی رہنمائی کے لیے بھی کوشاں ہے، وہ درحقیقت خود اپنے باطن میں کیا ہے، کن عناصر سے اس کی تعمیر ہوئی ہے کونسی قوتیں اس میں کام کر رہی ہیں، کون سے اسباب اس کو موجودہ مقام تک کھینچ کر لائے ہیں، اور اب کس رخ پر وہ جا رہی ہے۔ یہ مستند ذخیرۂ معلومات مختلف حیثیتوں سے ہمارے لیے مفید ہے۔ اس کا صرف یہی ایک فائدہ نہیں ہے کہ ترکی قوم کا حقیقی حال ہم پر روشن ہو گیا، بلکہ اس کا ایک بڑا فائدہ یہ بھی ہے کہ ٹرکی سے جو رہنمائی اب ہماری جدید نسلوں تک پہنچ رہی ہے اس کی روح کو ہم زیادہ بہتر طریقہ سے سمجھ سکتے ہیں اور دنیائے اسلام میں

جو انقلاب اس وقت رونما ہو رہا ہے اس کے اندرونی اسباب کو سمجھنے کا ایک اور موقع ہم کو مل گیا ہے۔

قبل اس کے کہ ہم خالدہ ادیب خانم کے ذریعہ سے ترکی جدید کو سمجھیں ہمیں خود ان کو اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے۔ اس میں کسی شک کی گنجائش نہیں کہ ان کا دل پورا پورا مسلمان ہے، ایمان سے لبریز ہے اور ایمان بھی ایسا جس پر ہم کو رشک کرنا چاہیے، کیونکہ وہ ایک مجاہد عورت کا ایمان ہے۔ الحاد اور بے دینی کا شائبہ تک ان کے خیالات میں نہیں پایا جاتا۔ اسلام سے ان کو محبت ہے، ویسی ہی محبت جیسی ایک سچی مسلمان عورت کو ہونی چاہیے لیکن ان کا دل جیسا مسلمان ہے، ان کا دماغ ویسا نہیں ہے۔ انہوں نے تمام تر مغربی طرز کی تعلیم پائی ہے، مغربی علوم ہی کا مطالعہ کیا ہے مغربی عینک ہی سے دنیا اور اسلام اور خود اپنی قوم کو دیکھنے اور ان کی تمام فکری اور نظری قوتیں مغربی سانچے ہی میں ڈھلی ہوئی ہیں۔ اگرچہ ان کے دل کی چھپی ہوئی اسلامیت اور مشرقیت نے بہت متغرب کے اس دماغی استیلار کی بہت کچھ مزاحمت کی ہے؛ اور اسی مزاحمت کا نتیجہ ہے کہ ترکی قوم کے دوسرے انقلابی لیڈروں کی بہ نسبت ان کے خیالات میں بہت کچھ اعتدال پایا جاتا ہے لیکن یہ مزاحمت ان کو مغربیت کے غلبہ سے نہیں بچا سکی ہے۔

اسلام کے متعلق ان کی معلومات بہت محدود معلوم ہوتی ہیں۔ قرآن اور سنت نبوی اور تاریخ اسلام کے مطالعہ میں انہوں نے شائد اس وقت کا دسواں حصہ بھی صرف نہیں کیا ہے جو مغربی فلسفہ اور تاریخ اور عمرانیات کے مطالعہ میں صرف کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام کے متعلق ان کے خیالات کی جو جھلک ہم کو ان کے خطبات میں نظر آتی ہے، اس میں حسن عقیدت تو ضرور موجود ہے۔ مگر فہم اور تدبر اور بصیرت بہت کم ہے۔

اپنے آخری خطبہ میں وہ فرماتی ہیں کہ گاندھی جی کی ذات "جدید اسلام کا ایک مکمل نمونہ ہے"۔ یہ بات وہی شخص کہہ سکتا ہے جو نہیں جانتا کہ اسلام کیا ہے؟ جدید اور قدیم کی نسبتوں سے کس قدر

بالا و برتر ہے اور اس کا مکمل نمونہ کیسا ہوتا ہے۔ اسلامی سیرت کی خصوصیات پر جس شخص کی نظر ہو، اور جس نے اس سیرت کے مکمل نمونوں کی ایک جھلک بھی دیکھی ہو، اس کی نگاہ میں گاندھی جی کی تو کیا حقیقت ہے، تاریخ عالم کے بڑے سے بڑے ہیرو بھی نہیں جچتے اور یہ کچھ قومی عصبیت کی بنا پر نہیں ناقابل انکار تاریخی حقائق کی بنا پر ہے۔ ابو بکر صدیقؓ، عمر فاروقؓ، علی مرتضیٰؓ، حسینؓ ابن علیؓ، احمد ابن حنبلؒ اور عبد القادر جیلانیؒ کی سیرتیں سامنے رکھیے اور پھر انصاف سے دیکھیے کہ انبیاء علیہم السلام کو چھوڑ کر تاریخ عالم کی کونسی شخصیت اس قابل ہے کہ ان سیرتوں کے مقابلہ میں لاکر رکھی جا سکے۔

عثمانی قوم کے سیاسی مزاج کی ترکیب میں ان کو ترکی قوم کی قدیم نسلی خصوصیات سے لیکر یونان، بائیزنٹائن، روم، حتیٰ کہ افلاطون کی جمہوریت تک، سب کے اثرات نظر آتے ہیں، مگر نہیں نظر آتے تو قرآن اور محمد نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم کے اثرات۔ حالانکہ جس چیز نے وسط ایشیا کے بدوی ترکوں کو تہذیب و تمدن سے آراستہ کیا، اور ان کے اندر جہاں کشائی کے ساتھ جہانبانی کی استعداد پیدا کی، اور ان کو نوع انسانی میں ایک تخریبی قوت کے بجائے ایک تعمیری طاقت بنا دیا وہ یہی تعلیم تھی۔ خالدہ خانم زیادہ سے زیادہ اسلام کا جو اثر "عثمانیت" میں دیکھ سکی ہیں وہ محض اسلامی عدل و مساوات ہے مگر اس کا حال بھی یہ ہے کہ جب سلطان سلیم اپنی رعایا میں بزور شمشیر اسلام کو پھیلانا چاہتا ہے، اور شیخ الاسلام جمالی افندی اس کو اس فعل سے باز رہنے کا حکم دیتا ہے، اور سلیم جیسا قہار فرمانروا اس حکم کے آگے سر جھکا دیتا ہے، تو اس عظیم الشان واقعہ میں خالدہ خانم کو اسلامی عدل کے بجائے "عثمانی قومیت" کا احساس اور "عثمانی اصول سلطنت کی حمایت" کا جذبہ ہی نظر آتا ہے۔ وہ نہیں سمجھتیں کہ جمالی آفندی کے فتوے میں لا اکراہ فی الدین کی روح تھی۔ اسلامی حق پرستی کی طاقت تھی جس نے سلیم کے سامنے اس کو فتوی دینے کی جرءت

دلائی اور اسلام کی عظمت تھی جس نے سلیم کو اس شرعی فتوے کے آگے سر جھکا دینے پر مجبور کر دیا۔
خالدہ خانم ترکی کے موجودہ حکمران طبقہ کی انتہا پسندی، استبدادیت، معاشرت کی جبری تنظیم، حد سے بڑھی ہوئی مغربیت، مادہ پرستانہ رجحانات، اور مذہب کے متعلق اس کی روش سے بیزار معلوم ہوتی ہیں۔ وہ "مغربیت" اور "مشرقیت" کا معتدل امتزاج چاہتی ہیں۔ "مادیت" اور "روحانیت" میں مصالحت کی خواہشمند ہیں، اور اس حقیقت کا بھی اعتراف کرتی ہیں کہ زندگی کے ان دونوں نظریوں میں جو امتزاج اسلام نے پیدا کیا ہے وہ سب سے بہتر ہے، اگر وہ خود اسلام میں پوری بصیرت نہیں رکھتیں، اس لیے ان کو نہیں معلوم کہ اصول اسلام کے تحت امتزاج کی صحیح صورت کیا ہے اور افراط و تفریط کے درمیان توسط و اعتدال کا خط مستقیم کہاں واقع ہے۔ تاہم اگر ان کی ذاتی آراء سے قطع نظر کر کے دیکھا جائے تو ان کے خطبات میں ہم کو ترکی جدید کی ذہنیت اور اس کے رجحانات، اور انقلاب کے تاریخی اسباب کا ایک صاف اور صحیح بیان مل جاتا ہے اور وہی ہم کو مطلوب ہے۔

ترکی قوم اسلام میں اس وقت داخل ہوئی جب مسلمانوں کے ذہنی انحطاط کا آغاز ہو چکا تھا، روح جہاد اگرچہ زندہ تھی، مگر روح اجتہاد مردہ ہو چکی تھی۔ اسلام میں بصیرت رکھنے والے مفکرین اور تفقہ سے بہرہ وافر رکھنے والے فقہاء ناپید تھے، تہذیب اسلامی نیم جان اور فکر اسلامی تقریب قریب بے جان ہو چکی تھی، شریعت میں تقلید جامد کا غلبہ تھا، تمدن میں عجمیت اور رومیت کے عناصر پیوست ہو چکے تھے، تصوف پر اشراقیت، اور تفکر پر تفلسف کا اثر غالب آگیا تھا، قرآن اور سنت سے براہ راست اکتساب علم کرنے والے مفقود تھے، علماء زیادہ تر الفاظ کے گورکھ دھندوں میں پھنسنے والے، کلام کی پیچیدگیوں میں الجھنے والے، اور متقدمین کے روندے ہوئے رستوں پر شرح و الفاظ کے چھکڑے چلانے والے تھے۔ امراء اکثر و بیشتر قیصر و کسریٰ کے

ڈھنگ پر چلنے والے تھے۔ متصوفین اور روحانی پیشوا اسلام کے دورِ اول کی حقیقی صوفیت سے بیگانہ، اور راہبوں، جوگیوں اور اشراقی فلسفیوں کی پیروی کرنے والے تھے علوم و فنون میں مسلمانوں کی ترقی رک گئی تھی تحقیق و اکتشاف کی راہ میں ان کے تقدمات قریب قریب ختم ہو گئے تھے، اور عروج کے بعد زوال کے آثار تمام ممالک اسلامیہ میں پیدا ہو چکے تھے۔

اس طرح اسلامی تاریخ میں ترکوں کی ابتدا ہی ایک بنیادی کمزوری کے ساتھ ہوئی۔ دولت عثمانیہ کا قیام تقریباً اسی زمانہ میں ہوا ہے جب یورپ میں ذہنی ارتقا اور علمی نہضت کا آغاز ہو رہا تھا۔ اگرچہ عثمانیوں نے ابتدائی دو ڈھائی صدیوں میں یورپ کو پیہم شکستیں دے کر اسلام کی دھاک بٹھا دی تھی، لیکن اس زمانہ میں عام مسلمان قوموں کے ساتھ ساتھ ترک بھی رفتہ رفتہ تنزل کی طرف جا رہے تھے، اور ان کا مقابلہ جن مغربی قوموں سے تھا وہ تیز رفتاری کے ساتھ مادی اور ذہنی ترقی کی راہ میں گامزن تھیں۔ سترھویں صدی عیسوی میں حالات نے پلٹا کھایا فرنگیوں کی عسکری تنظیم اور مادی و معنوی قوت اس حد تک بڑھ گئی کہ انہوں نے سینٹ گوتھرڈ کے معرکہ میں پہلی مرتبہ تنزل پذیر ترکوں کو نمایاں شکست دی۔ مگر ترکوں کی آنکھیں نہ کھلیں۔ وہ برابر پستی میں گرتے رہے اور فرنگی برابر ترقی کرتے رہے۔ یہاں تک کہ اٹھارہویں صدی میں ترکوں کی اخلاقی، مذہبی، سیاسی، علمی، اور تمدنی حالت انتہائی تنزل کو پہنچ گئی اور ان پر فرنگیوں کا غلبہ پوری طرح نمایاں ہو گیا۔

انیسویں صدی کے آغاز میں سلطان سلیم نے اس کمزوری کو محسوس کیا اور انتظام سلطنت کی اصلاح، علوم جدیدہ کی اشاعت، طرز جدید پر عسکری تنظیم، اور جدید مغربی آلات حرب کی ترویج شروع کی لیکن جاہل صوفیوں اور تنگ نظر علما نے جو دین کے علم اور اس کی روح سے قطعاً بے بہرہ تھے، مذہب کے نام پر اصلاحات کی مخالفت کی یورپین طرز پر فوج کی تنظیم کو بے دینی

تعبیر کیا جدید فوجی وردیوں کو تشبہ بالنصاریٰ قرار دیا سنگین تک کے استعمال کی اس لیے مخالفت کی گئی کہ کافروں کے اسلحہ استعمال کرنا ان کے نزدیک گناہ تھا سلیم کے خلاف یہ کہکر نفرت پھیلائی گئی کہ وہ کفار کے طریقے رائج کر کے اسلام کو خراب کر رہا ہے شیخ الاسلام عطار اللہ افندی نے فتویٰ دیا کہ ایسا بادشاہ جو قرآن کے خلاف 'عمل کرتا ہو' بادشاہی کے لائق نہیں۔ آخر کار ۱۸۰۷ء میں سلیم کو معزول کر دیا گیا۔ یہ پہلا موقع تھا کہ مذہبی پیشواؤں نے اپنی جہالت اور تاریک خیالی سے اسلام کے مانع ترقی ہونے کا غلط تخیل پیدا کیا۔

زمانے کے حالات تیزی کے ساتھ بدل رہے تھے دوسرے مسلمانوں کی بہ نسبت ترکوں پر ان تغیرات کا زیادہ اثر پڑ رہا تھا۔ وہ یورپ کے عین مقابل برسرپیکار تھے۔ مغربی قوموں کے ساتھ ان کے سیاسی تمدنی اور تجارتی تعلقات نہایت گہرے تھے، اور خود ان کی ماتحت یورپین اور عیسائی قومیں سرعت کے ساتھ مغرب کے اثرات قبول کر رہی تھیں مگر ترکوں کے مذہبی پیشواؤں نے جو تفقہ اور اجتہاد سے نا اہل عاری، اور اسلام کی حقیقی تعلیمات سے قطعاً ناواقف تھے، ان تغیرات کی طرف سے آنکھیں بند کر لیں اور ترکی قوم کو مجبور کیا کہ سات سو برس قبل کی فضا سے ایک قدم آگے نہ بڑھیں۔ سلیم کے بعد محمود نے اصلاح کی کوششیں کیں، اور علماء و مشائخ نے پھر مخالفت کی، بڑی مشکلات کا مقابلہ کرنے کے بعد ۱۸۲۶ء میں محمود اس قابل ہو سکا کہ جدید عسکری تنظیم کو رائج کرے مگر علما اور درویش برابر یہی تبلیغ کرتے رہے کہ یہ اصلاحات بدعت ہیں 'ان سے اسلام کو خراب کیا جا رہا ہے، سلطان بے دین ہو گیا ہے' اور طرز جدید کی فوج میں بھرتی ہونا مسلمانوں کے لیے خرابی ایمان کا موجب ہے۔

یہ وہ زمانہ تھا جب ترکوں کے اہل دماغ لوگوں میں اپنی قومی پستی کا عام احساس پیدا ہو چکا تھا۔ ان لوگوں نے مغربی قوموں کی ترقی کے اسباب پر غور کیا، ان کے علوم و آداب کا مطالعہ کیا، ان کی تنظیمات پر گہری نگاہ ڈالی، اور اپنی سلطنت کے قوانین، انتظامی امور،

تعلیمی ادارات اور حربی نظام میں ایسی اصلاحات نافذ کرنے کی کوشش کی جن سے وہ مغربی قوموں کے دوش بدوش ترقی کر سکیں۔ خالدہ خانم کے بقول یہ وہ لوگ تھے جن کے رگ و پے میں اسلامیت بیٹھی ہوئی تھی۔ ان کے دل اور دماغ دونوں مسلمان تھے۔ ان میں اپنی کمزوری کا احساس ضرور تھا مگر مغرب کے مقابلہ میں کمتری کا احساس ہرگز نہیں تھا۔ وہ مغرب سے مرعوب نہ تھے بلا امتیاز اس کی ہر چیز کو قبول کرنے والے نہ تھے ان کا مقصد صرف یہ تھا کہ مغرب کی مفید چیزوں کو لے کر اپنی سلطنت اور اپنی قوم کی کمزوریوں کو دور کر دیں، اور زندگی کے میدان میں یورپ کے ساتھ برابر کی مسابقت کر سکیں انھوں نے سلطان عبد المجید خان کے زمانہ میں نظام سلطنت کی اصلاح اور فوج کی تنظیم کیا۔ اپنی قوم کے ادبیات میں زندگی کی نئی روح پھونکی نئے مدارس اور کالج قائم کیے، اور چند سال کے اندر ایک ایسی نسل تیار کر دی جس میں اسلامی تہذیب کے تمام جوہروں کے ساتھ تفکر و تدبر کی اعلیٰ صلاحیتیں بھی موجود تھیں سلطان عبد العزیز کے عزل (۱۸۷۶ء) تک اس گروہ نے بے شمار خارجی و داخلی مشکلات کے باوجود تعمیر ملت کا بہترین کام انجام دیا، اور اس کے ثمرات عمر پاشا جیسے جنرل، مدحت پاشا جیسے مدبر اور نامق کمال اور عبد الحق حمید جیسے سچے مسلمان اہل فکر و ادب کی صورت میں ظاہر ہوئے۔

لیکن سلطان عبد الحمید نے آکر دفعتاً حرکت کا رخ بدل دیا۔ ۱۸۷۶ء سے لیکر ۱۹۰۹ء تک ۳۳ سال کا زمانہ جس میں ایک دوسری مشرقی قوم (جاپان) ترقی کر کے کہیں سے کہیں پہنچ گئی، اس خود غرض سلطان نے محض اپنے شخصی اقتدار کی خاطر ترکی قوم کی علمی، ذہنی، تمدنی اور سیاسی و تنظیمی ترقی کو روکنے اور اس کی روح کو مردہ کرنے میں صرف کر دیا۔ یہاں موقع نہیں کہ اس شخص کے اعمال پر کوئی تفصیلی تبصرہ کیا جا سکے۔ مختصر یہ ہے کہ اس نے تعمیر کے بہترین زمانے کو جس کی ایک ایک ساعت بیش قیمت تھی، تخریب میں کھو دیا اس نے ترکی قوم کے بہترین دماغوں کو برباد کیا، جمال الدین افغانی جیسا بے نظیر آدمی اسے ملا

اور اس کو بھی اس شخص نے ضائع کر دیا، مگر سب سے بڑا نقصان جو اس کی بدولت نہ صرف ترکی قوم بلکہ دنیائے اسلام اور خود اسلام کو پہنچا وہ یہ تھا کہ اس نے خلافت کے مذہبی اقتدار اور رجعت پسند علماء و مشائخ کے اثرات کو عہد تنظیمات کے ترکی مصلحین کی اٹھائی ہوئی بنیادیں اکھیڑنے، اور ترکی قوم کے ادبی و ذہنی ارتقاء کو روکنے، اور سیاسی و تنظیمی اصلاحات کا استیصال کرنے کے لیے استعمال کیا، جس سے ترکوں کی نئی نسل میں ایک انقلابی بحران پیدا ہو گیا۔ وہ مذہب کو مانع ترقی سمجھنے لگے، اسلامیت سے ان کے دماغ منحرف ہو گئے، تاریک خیال علماء اور مشائخ سے بجا طور پر جو نفرت ان کے دلوں میں پیدا ہوئی تھی انقلابیت کے جوش میں اس کا رخ مذہب کی طرف پھر گیا، وہ سمجھے اور جاہل علما و مشائخ نے ان کو یہ سمجھنے پر مجبور کر دیا کہ اسلام ایک جامد مذہب ہے، زمانہ کی رفتار کے ساتھ حرکت کرنے کی اس میں صلاحیت نہیں، اس کے قوانین تغیرات احوال کا ساتھ نہیں دے سکتے، اور بجز چند عقائد کے اس میں کوئی دوسری چیز ایسی نہیں جو اپنے اندر کوئی پائیداری رکھتی ہو۔ اس ۳۳ برس کے استبداد نے، جو بدقسمتی سے مذہبی رنگ لیے ہوئے تھا، ترکوں کی نئی نسلوں میں مادہ پرستی، دہریت، مغرب سے کامل مرعوبیت، مغربی تخیلات کی اندھی تقلید، اپنے ماضی سے نفرت، ہر قدیم چیز سے بیزاری اور خلافت و وحدت اسلامی سے (جس کو سلطان عبدالحمید نے اپنی اغراض کا آلہ کار بنایا تھا) کراہت تام پیدا کر دی، اور ان کے اندر یہ خیال راسخ کر دیا کہ دنیا میں سربلندی حاصل کرنے کے لیے تمام پچھلی بنیادوں کو ڈھا کر بالکل مغربی طرز پر ترکیت کا قصر تعمیر کرنا ضروری ہے۔

۱۹۰۸ء کے انقلاب نے سلطان عبدالحمید خاں کی حکومت کا تختہ الٹ دیا اور سلطنت کی عنان اقتدار ان منحرف ذہنیت رکھنے والے جوشیلے اور مشتعل نوجوانوں کے ہاتھوں میں آگئی۔ خالدہ ادیب خانم کے بقول یہ لوگ عہد تنظیمات کے اصلاح پسندوں سے بالکل مختلف تھے۔ ان میں ایک بھی ایسا

شخص نہ تھا جو علمی قابلیت، تدبر و تفکر اور عالی دماغی میں دو تنظیمات کے مدبرین کی ٹکر کا ہو۔ نہ ان کے پیش نظر وہ بلند نصب العین تھے، نہ ان کی سیرتوں میں وہ مضبوطی تھی، نہ شائستگی اور تربیت کے لحاظ سے اِن کا اُن سے کوئی مقابلہ تھا نہ قومی فخر و ناز کا وہ جذبہ ان میں موجود تھا، نہ تنقید کی وہ صلاحیت تھی کہ قدیم اور جدید کے صحیح فرق کو سمجھ سکیں۔ یہ چند ایسے نوجوانوں کا مجمع تھا جو اسلامی علوم میں کورے تھے، اسلامی تربیت میں ناقص تھے، مغربی علوم میں بھی کوئی گہری نظر نہ رکھتے تھے، اپنے مذہب اپنی تہذیب، اپنے علوم و آداب، اور اپنی قدیم اجتماعی تنظیمات کے خلاف ان کے دل و دماغ میں تعصب کا گہرا جذبہ پیدا ہو چکا تھا، مغرب کے تقدمات سے مرعوبیت ان کے اندر بدرجۂ اتم پیدا ہو گئی تھی اور یہ اپنی ہر چیز کو مغرب کی چیز سے بدل دینے کے لیے بے چین تھے۔ جب سلطنت ان کے ہاتھوں میں آئی تو یہ بند پانی جس کو ۳۳ برس کی طویل بندش نے بہت کچھ فاسد کر دیا تھا، طوفان کی شکل میں پھوٹ نکلا۔ یہی وہ زمانہ ہے جس میں ترکوں پر نیشنلزم اور طورانی عصبیت کا جن سوار ہوا، وحدت اسلامی کی طرف سے سرد مہری ظاہر ہونی شروع ہوئی، مذہب پر نکتہ چینی کا آغاز ہوا، قدیم تہذیب کو مٹا کر مغربی تہذیب کو بالکلیہ اختیار کر لینے پر زور دیا جانے لگا، ماضی سے تعلق منقطع کرنے اور مغرب سے قریب تر ہونے کے لیے لاطینی رسم الخط اختیار کرنے کی تجویز پیش ہوئی، جدید نظریات کے مطابق اسلام کو ڈھالنے کے لیے سرکاری علماء کا ایک گروہ اٹھا جس کا سرغنہ ضیا کوک الپ جیسا شخص تھا۔ یہ وہی شخص ہے جس نے اتحاد اسلامی کے مقابلہ میں اتحاد طورانی کی زبردست تبلیغ کی، ترکوں کو عہد اسلامی کی ترکی تاریخ اور اس کے نامور بہادروں سے نفرت دلا کر قدیم وحشی تاتاریوں پر فخر کرنا سکھایا (جن میں چنگیز و ہلاکو کی شخصیتیں سب سے زیادہ نمایاں ہیں)، ترکی زبان کو اسلامی ادب کی خصوصیات سے پاک کرنے کی کوشش کی، اور تمدن، معاشرت، تہذیب و اطوار اور عملی زندگی کے تمام طریقوں میں مغرب

کی پوری تقلید کرنے پر زور دیا۔ یہ خیالات رکھنے والا شخص، جدید انقلابی جماعت کا امام مجتہد بن کر اٹھا اور اس نے کوشش شروع کی کہ اپنے متبعین کے ساتھ مل کر اسلامی تعلیمات کی ایسی تعبیر کرے جس سے چند گنے چنے عقائد اور اخلاقی اصولوں کے سوا اسلام کی ہر چیز کو قابل تغیر ثابت کر کے مغربی سانچے میں ڈھال دیا جا سکے۔

ایک طرف ترکی قوم میں اتنے بڑے انقلاب کی ابتدا ہو رہی تھی، دوسری طرف ترکوں کے علماء اور مشائخ تھے جو اب بھی ساتویں صدی کی فضاء سے نکلنے پر آمادہ نہ تھے ان کے جمود، ان کی تاریک خیالی، ان کی رجعت پسندی، اور زمانہ کے ساتھ حرکت کرنے سے ان کے قطعی انکار کا اب بھی وہی حال تھا جو سلطان سلیم کے زمانہ میں تھا۔ وہ اب بھی کہہ رہے تھے کہ چوتھی صدی کے بعد اجتہاد کا دروازہ بند ہو چکا ہے، حالانکہ ان کی آنکھوں کے سامنے الحاد کا دروازہ کھل رہا تھا۔ وہ ابھی تک فلسفہ اور کلام کی وہی کتابیں پڑھنے پڑھانے میں مشغول تھے جن کو پھینک کر زمانہ پانچ سو برس آگے نکل چکا تھا۔ وہ اب بھی اپنے وعظوں میں قرآن کی وہی تفسیریں اور وہی ضعیف حدیثیں سنائے جا رہے تھے جن کو سن کر سو برس پہلے تک کے لوگ تو سر دھنتے تھے، مگر آج کل کے دماغ ان کو سن کر نہ صرف ان مفسرین و محدثین بلکہ خود قرآن و حدیث سے منحرف ہو جاتے ہیں، وہ ابھی تک اصرار کر رہے تھے کہ ترکی قوم میں وہی فقہی قوانین نافذ کئے جائیں گے جو شامی اور کنز الدقائق میں لکھے ہوئے ہیں خواہ اس اصرار کا نتیجہ یہی کیوں نہ ہو کہ ترک اُن قوانین کے اتباع سے بھی آزاد ہو جائیں جو قرآن اور سنت رسول میں مقرر کیے گئے ہیں۔

غرض ایک طرف علما اور مشائخ اپنی اسی روش پر قائم رہے، جو ترکی قوم کو سو برس کے اندر تنظیمات کے مقام سے ہٹا کر انقلابیت کے اِس مقام تک کھینچ لائی تھی، اور دوسری طرف

ترکی قوم کے انقلابی لیڈروں سے مسلمان ہونے کے باوجود، دماغ اور فکر وعمل کی واقعی دنیا میں اسلام سے دور اور دور تر ہوتے چلے جا رہے تھے۔ اسی زمانہ میں جنگ عظیم پیش آئی جس میں عرب اور ہندوستان کے بدقسمت مسلمانوں نے اعدائے اسلام کے ساتھ مل کر ترکوں کے گلے کاٹے پھر جنگ عظیم کے بعد جب ترکوں نے اپنی حیات قومی کو کامل تباہی سے بچانے کے لیے جدوجہد شروع کی تو اس میں سب سے زیادہ ان کی مخالفت جنہوں نے کی وہ خلیفۂ وقت اور شیخ الاسلام تھے۔ یہ آخری ضربات انقلابی ترک کی نیم جان اسلامیت کے لیے فیصلہ کن تھیں۔ انہی کا نتیجہ ہے جو آج ہمکو ترکی جدید کی غیر معتدل تجدد پسندی کی شکل میں نظر آ رہا ہے ۱۹۰۸ء میں جو انقلابی خیالات خام تھے، اور جن کو جنگ طرابلس، جنگ بلقان، جنگ عظیم اور حملۂ یونان کی مشغولیتوں نے پختہ ہونے سے روک رکھا تھا وہ لوزان کانفرنس کے بعد تکمیل کو پہنچ گئے اور عملی شکل اختیار کرنے لگے۔ تمدن و معاشرت میں کامل مغربیت، زبان اور ادب اور سیاست میں انتہا درجہ کی جنسی عصبیت، الغائے خلافت کے بعد مذہب و سلطنت کی تفریق اور پھر خالدہ خانم کے بقول سلطنت کو مذہب سے آزاد کر کے مذہب کو سلطنت کا پابند بنا دینا اسلامی قانون کے بجائے سوئیٹزرلینڈ کا قانون اختیار کرنا، وراثت اور طلاق وغیرہ مسائل میں قرآن کے صریح احکام تک کو بدل ڈالنا، عورتوں کو اسلامی تعلیم کے بالکل خلاف اس آزادی کی روش پر ڈال دینا جس پر جنگ عظیم کے بعد یورپ کی عورتیں چل رہی ہیں، یہ سب قدرتی نتائج ہیں جاہل علما کے جمود، اور ہوا پرست صوفیا کی گمراہی، اور خلافت کے منصب سے ناجائز فائدہ اٹھانے والے سلاطین کی خودغرضی، اور انقلابی لیڈروں کی قرآن وسنت رسول کے علم سے کلی جہالت کے۔ افسوس کہ اس صدی میں ترکی قوم نے ایک بھی ایسا شخص پیدا نہیں کیا جو قرآن میں بصیرت رکھنے والا اور اسلامی تعلیم کی حقیقی روح کو سمجھنے والا ہوتا، اور زمانے کے متغیر

حالات پر گہری نگاہ ڈال کر صحیح اجتہادی قوت سے کام لیتا، اور اصول اسلام کو ان حالات پر منطبق کر کے ایک ایسا سمویا ہوا نظام مرتب کر دیتا جس کی اساس کتاب وسنت پر ہوتی اور جس میں رفتار زمانہ کے ساتھ حرکت کرنے کی صلاحیت ہوتی۔

ترکی تاریخ کے ان تحولات سے جو لوگ واقف نہیں ہیں وہ عجیب عجیب غلطیوں کا شکار ہو رہے ہیں۔ پرانے مذہبی خیال کے لوگ نوجوان ترکوں پر کفر اور فسق کے فتوے لگا رہے ہیں، مگر ان کو خبر نہیں کہ نوجوان ترکوں سے زیادہ گنہگار تو ترکی کے علماء اور مشائخ ہیں، انہی کے جمود نے ایک مجاہد قوم کو جو پانچ سو برس سے اسلام کے لیے تن تنہا سینہ سپر تھی اسلامیت سے فرنگیت کی طرف دھکیلا ہے اور اندیشہ ہے کہ ایسے ہی جامدین دوسری مسلمان قوموں کو بھی ایک روز اسی جانب دھکیل کر رہیں گے۔ دوسری طرف جدت پسند حضرات ہر اس وحی کو جو انقرہ سے نازل ہوتی ہے، مسلمانوں کے سامنے اس طرح پیش کر رہے ہیں گویا قرآن منسوخ ہو چکا، محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت ختم ہو گئی، اور اب ہدایت ہے تو اتاترک کے اسوہ اور انقرہ سے اتری ہوئی وحی میں ہے۔ حالانکہ بیچارے اتاترک اور اس کے متبعین کا حال یہ ہے کہ وَمَا لَهُم بِذَٰلِكَ مِنْ عِلْمٍ إِنْ هُمْ إِلَّا يَخْرُصُونَ۔

مکتبۂ علمیہ

سلطنت آصفیہ میں یہ ایک ہی مکمل تجارتی کتب خانہ ہے جو خاموشی کے ساتھ اردو زبان کی خدمت انجام دے رہا ہے اور
جہاں سے ہر مذاق اور ہر علم و فن کی اردو عربی فارسی اور انگریزی کتب اور ان کے تراجم مل سکتے ہیں طلبا کے لیے درسی
کتب کا بھی انتظام کیا گیا ہے بیرونی مقامات کے لوگوں کو بھی حسب فرمائش کتابیں بھیجی جا سکتی ہیں جو مصنفین و مولفین حیدرآباد
میں اپنی تصانیف کی اشاعت اور ان کی فروخت کا معقول انتظام چاہتے ہوں وہ مہتمم مکتبہ سے ذریعہ خط و کتابت جملہ امور کا
تصفیہ فرما سکتے ہیں حیدرآباد کے مشہور اور نامور شعرا اور مصنفین کی تصانیف آپ کو مکتبہ ہی سے مل سکتی ہیں آج ہی ایک کارڈ لکھ کر
فہرست مفت **مالک خواجہ بہاء الدین صاحب مکتبۂ علمیہ چار مینار حیدرآباد دکن** طلب فرمائیے۔

قواعد

رسالہ ترجمان القرآن بالعموم ہر ہجری مہینے کی ۲۰ تاریخ کو شائع ہوا کرے گا مہینہ کے آخر تک جن حضرات کے پاس پرچہ
نہ پہنچے وہ دوبارہ لکھ کر منگوا سکتے ہیں ختم ماہ کے بعد دوسرے مہینے کی ابتدا میں جن خریداروں کی شکایات موصول ہوں گی ان کو پرچہ قیمتاً دیا جائیگا۔
جو حضرات اپنی جائے قیام طویل مدت کے لیے تبدیل کریں انہیں اپنے جدید پتے کی اطلاع دفتر کو بھیج دینی چاہیے
ورنہ پرچہ نہ پہنچنے کی ذمہ داری دفتر پر نہ ہوگی۔

خریداروں کو دفتر سے مراسلت کرنے میں ہمیشہ نمبر خریداری کا حوالہ ضرور دینا چاہیے لیکن یہ لحاظ رہے
کہ رجسٹر نمبر اور چیز ہے اور نمبر خریداری اور چیز

اشاعت کے لیے مضامین و حل طلب مسائل تمام ایڈیٹر کے نام بھیجے جائیں لیکن ایڈیٹر پر لازم نہیں کہ ہر چیز شائع کرے

منیجر ترجمان القرآن بدر الدین بلڈنگ نظام شاہی روڈ حیدرآباد دکن

(طابع و ناشر سید ابو الاعلیٰ مودودی)
(مطبوعہ منظم پریس جام پریس چار مینار حیدرآباد دکن)

اُردو زبان کی ایک پرشکوہ کتاب

تمدن عرب

جو مدتوں سے نایاب تھی پہلے ایڈیشن ۱۸۹۸ء

کی ۶۰۰ صفحہ ضخامت جامع خصوصیات کے ساتھ طبع ہو رہی ہے (۱۴۵) امریکن بلاک (۱۵۰) صفحے اعلیٰ کاغذ
نفیس چھپائی بہترین سنہری جلد فرانس کے مایۂ ناز مورخ ڈاکٹر گستاؤلی بان کی اصل کتاب کا ترجمہ

مولوی سید علی بلگرامی مرحوم کا بے مثل علمی کارنامہ

جس کی پچاس روپیہ قیمت تھی مگر ایک سو روپیہ میں بھی نہیں مل سکتی تھی

اعلیحضرت فرمانروائے دکن (مدظلہ) کے

جشن سیمین کی شادمانی میں غرۂ ذی حجہ ۱۳۵۴ھ تک شائع ہو جائے گی

پیشگی رعایتی قیمت دس روپے بعد طبع پندرہ روپے

جامعہ عثمانیہ کی جملہ مطبوعات ہر قسم کی نادرِ روزگار کتابوں کے لیئے

سید عبد القادر

پبلشر گورنمنٹ ایجوکیشنل پرنٹر و پروپرائٹر اعظم اسٹیم پریس چار مینار حیدرآباد دکن کا (پتہ یاد رکھیں)